إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

ستمبر ۲۰۱۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۷، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۳ء/ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ

مشمولات

○فکر و نظر

امت کا المیہ — مدیر — ۴

○شذرات

قصور وار ہم ہیں یا مغربی سازشیں؟ — مدیر — ۶

طالبان سے مذاکرات کو کامیاب بنایا جائے — مدیر — ۸

○تعلیم و تربیت

اسلامی سکول قائم کیے جائیں — مفتی محمد رفیع عثمانی — ۱۰

تعلیم کا مسئلہ اور اس کا حل — انجینئر مختار فاروقی — ۱۴

○مقالۂ خصوصی

غلبۂ دین بذریعہ جمہوریت؟ (مصر کے حالیہ تجربے کی روشنی میں) — ڈاکٹر محمد امین — ۲۲

○دینی مدارس کی تعلیم

حضرت مدنیؒ کے نصاب پر ماہنامہ القاسم کا تبصرہ — مولانا عبدالقیوم حقانی — ۲۹

○میڈیا

بچوں پر جنسی تشدد — مدیر — ۳۱

○فکر مغرب

ہیومنزم کیا ہے؟ — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۳۲

تارِ عنکبوت (مغربی فکر کی حمایت میں مولانا وحیدالدین کے دلائل کا تجزیہ) — فصیح احمد — ۳۸

○تفہیم مغرب

جمہوریت - ایک یہودی پھندا — ڈاکٹر عبدالرؤف نظامی — ۵۱

فکر و نظر

امت کا المیہ

جب تک یہ سطور قارئین تک پہنچیں ممکن ہے شام پر امریکی حملہ شروع ہو چکا ہو اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا رہی ہو۔

امت کا حال دیکھ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شام میں اقلیتی نُصَیری فرقہ پچھلے چالیس سال سے اقتدار پر قابض ہے۔ یہ حکمران طبقے کی دوسری نسل ہے جو ظلم اور جبر سے اکثریت پر حکمرانی کر رہی ہے۔ پچھلے دنوں جب عرب دنیا میں آمریتوں کے خلاف مزاحمت و تبدیلی کی لہر اُٹھی تو شام میں بھی لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بدقسمتی سے ایران نے شام کے جابر حکمران اقلیتی گروہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا صرف اس لیے کہ وہ شیعہ ہے۔ جواب میں سعودی عرب اور ترکی نے مظلوم اکثریت کا ساتھ دینا شروع کیا کہ وہ سنی تھے۔ یوں شام میں مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور ملک تباہ ہو رہا ہے۔

امریکہ و یورپ کے پیش نظر اسرائیل کا تحفظ اور مسلم دشمنی ہے۔ عراق کو تباہ کرنے اور مصر کو رام کرنے کے بعد اب بڑا مقصد شام کی فوجی قوت کا خاتمہ اور اسے کمزور کرنا ہے۔ اس کے لیے پہلے وہ پس پردہ رہ کر کام کر رہے تھے، ڈوریاں ہلاتے تھے اور ’باغیوں‘ کو پیسہ اور اسلحہ دیتے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ مسلح مزاحمت کی قیادت اسلامی گروپوں کی بجائے سیکولر لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے چنانچہ القاعدہ کے وہاں پہنچنے کا پروپیگنڈا کیا گیا اور سیکولر قیادت کو ابھار کر آگے لایا گیا۔ امریکہ و یورپ کا توڑ کرنے کے لیے ایران نے روس و چین کی حمایت حاصل کر لی اور وہ سلامتی کونسل میں شام میں کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال کے خلاف امریکہ و یورپ کی مذمتی قراردادوں کو ویٹو کر رہے ہیں اور روس نے شام پر امریکی حملے کی صورت میں سعودی عرب پر حملے کی دھمکی دے دی ہے۔

یہ سب کچھ ہو رہا ہے، ہم اور آپ بے بسی سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہے ہیں لیکن عالم اسلام میں کوئی ادارہ ایسا نہیں، کوئی ملک ایسا نہیں، کوئی شخصیت ایسی نہیں جو اصلاح احوال کے لیے اٹھے، لڑنے والے مسلمانوں میں صلح کرائے، آگ پر پانی ڈالے اور حالات کو بگڑنے سے بچائے۔ اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC) سوئی ہوئی ہے، رابطہ عالم اسلامی تو خیر خود سعودی حکمرانوں کی قائم کردہ تھی موتمر عالم اسلامی جو ایک غیر حکومتی تنظیم ہوا کرتی تھی وہ بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہے۔ پاکستان سے کیا توقع کی جائے کہ وہ اپنے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ اسے اپنا ہوش نہیں۔ وہ عرصے تک شام کا یہ منظر نامہ دیکھتا رہا

اور خاموش رہا۔ اب مجبوراً کسی موقف کا اظہار کرنا پڑا ہے تو یہ کہہ رہا ہے کہ شام پر حملہ نہ کیا جائے۔ ہم کہیں نہ کہیں ساری دنیا کہتی ہے کہ پاکستان امریکی بلاک کا حصہ ہے اور امریکی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا ورنہ امہ کی خدمت کا اور پاکستان کے عالم اسلام کی قیادت کا حق ادا کرنے کا یہ سنہری موقعہ ہے۔ میاں نواز شریف صاحب اسلامی کانفرنس تنظیم کا اجلاس بلائیں اور لڑنے والے بھائیوں میں صلاح کرائیں تو یہ ناممکن تو نہیں ہے؟

فی الحال تو یہ ہو رہا ہے کہ ہم اپنی بے وقوفی سے شیعہ سنی مسئلے کو مقامی سطح سے اُٹھا کر عالمی سطح تک لے گئے ہیں اور استعمار نے جس طرح عربوں کو ترکوں سے لڑا کر امت کو کمزور کیا تھا اب وہ شیعہ سنی کو لڑا کر اپنے مفادات کو آگے بڑھائے گا۔ اس طرح ایران جو بظاہر امریکہ مخالف ہے، اب محض اپنے فرقہ وارانہ مفادات کی خاطر مسلم امہ کو کمزور کرنے اور تقسیم کرنے میں امریکہ کی بالواسطہ حمایت کا سبب بن رہا ہے۔

کیا امت میں کوئی ادارہ، کوئی ملک، کوئی شخصیت ایسی ہے جو اس کے مفادات کی نگہبانی کرے؟ دوسری جنگ عظیم کے بعد اہل مغرب جب مسلمان ممالک کو بظاہر آزادی دینے پر مجبور ہوئے تو انہوں نے امن کا بھیس بدل کر میڈیا، تعلیم، معیشت اور سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی مہم جاری رکھی۔ جب اس کے باوجود کچھ مسلمان ملک ترقی کر کے ابھرنا شروع ہو گئے تو مغربی تہذیب کے علم برداروں نے امن کا چولا اتار پھینکا اور اپنی مہیب جنگی مشینری سے پہلے عراق کو کچلا، پھر افغانستان کو، اس کے بعد لیبیا کی باری آئی۔ اب شام پر حملہ ہونے جا رہا ہے جب کہ پاکستان، یمن اور صومالیہ پر ڈرون حملوں کی یلغار پہلے ہی جاری ہے۔ کوئی ہے امت میں جو سوچے کہ اگر مسلم ممالک اسی طرح ایک ایک کر کے پٹتے چلے گئے تو عالم اسلام کا کیا بنے گا؟ یہودیوں، عیسائیوں اور مغرب کی الحادی تہذیب کے علم برداروں کی یہ صلیبی آندھی آخر کہاں رکے گی اور اسے کون روکے گا؟

اپنے جسم کے وقار کے لیے اپنا سر ہمیشہ اونچا رکھیے

اور

اور اپنی ذات کے وقار کے لیے اپنی نظریں اور لہجہ ہمیشہ نیچا رکھیے

شذرات

قصوروار ہم ہیں یا مغربی سازشیں؟

اس بارے میں تین نقطۂ ہائے نظر پائے جاتے ہیں:

۱۔ قصوروار ہم ہیں نہ کہ مغربی سازشیں۔ہم اپنا تجزیہ نہیں کرتے، اپنا احتساب نہیں کرتے، اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ادراک نہیں کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش نہیں کرتے اور ہر بات مغرب کے پیٹے میں ڈال دیتے ہیں کہ وہ ہمارے خلاف سازشیں کرتا ہے۔

۲۔ ہمارے اکثر مسائل کا ذمہ دار مغرب ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے اور ان کے خلاف منظم سازشیں کرتا رہتا ہے۔ خصوصاً یہودی (بلکہ صہیونی) مغربی مما لک، انڈیا اور روس سب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور ایک ہمہ گیر منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کو ذہنی غلام، جہالت وافلاس میں مبتلا، پسماندہ، پیچ اور شکست خوردہ دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہر طرح کی سازشیں اور ذرائع بروئے کار لاتے ہیں۔

۳۔ مسلمان اپنے اعمال کے خود بھی ذمہ دار ہیں اور مغرب کی سازشیں بھی بلا شبہ موجود ہیں لہٰذا مسلمانوں کو اپنی اصلاح بھی کرنی چاہیے، اپنا احتساب بھی کرنا چاہیے اور اپنے حالات ٹھیک کرنے کے لیے جدوجہد بھی کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ مغربی فکر وتہذیب کے علم بردار مغربی مما لک اور یہود وہنود کی سازشوں کا توڑ بھی کرنا چاہیے اور ان سے بچتے ہوئے اپنا لائحہ عمل تشکیل دینا چاہیے۔

اب آیئے اس حوالے سے البرہان کے نقطۂ نظر کی طرف۔ ہمارے فاضل دوست پروفیسر ملک محمد حسین صاحب جو اکثر البرہان میں لکھتے رہتے ہیں، پہلے نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ ہم ان کا نقطۂ نظر ان کے الفاظ میں طبع بھی کر دیتے ہیں تاہم ہمارا نقطۂ نظر تیسرا ہے کہ ہم خود بھی قصوروار ہیں اور مغربی سازشیں بھی ایک حقیقت ہیں لہٰذا ہمیں اپنی بھی اصلاح کرنی چاہیے اور مغربی سازشوں کو سمجھ کر ان کا توڑ بھی کرنا چاہیے۔ لیکن مغرب کی مذمت چونکہ ہم پرزور الفاظ میں کرتے ہیں اور جب اپنوں کو اصلاح کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو نرم الفاظ استعمال کرتے ہیں تو شائد یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ہم دوسرے نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا اسلوب مبنی برحکمت ہے اور ایک جواز رکھتا ہے۔ اصلاح درکار ہو تو نرمی ہی سے توجہ دلانی چاہیے کہ سخت لہجہ استعمال کریں گے تو فریق ثانی اسے تنقید اور مخالفت سمجھے گا اور ردعمل کا شکار ہو کر اصلاح کا نہیں سوچے گا اور اگر یہود وہنود ونصاریٰ کی ہم پرزور مذمت

نہیں کریں گے اور ان کے دجل وفریب کا پول نہیں کھولیں گے تو مسلمان ان کی سازشوں کو نہیں سمجھیں گے اور نہ ان سے لاحق ہونے والے مضرات اور خطرات کے دفعیے کا سوچیں گے۔

اسی لیے ہمیں اقبال کے اس شعر سے اتفاق نہیں ہے جس میں وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تُو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

بلکہ ہمیں اپنے مسلمان بھائیوں سے گلہ ہے کہ وہ امریکہ ویورپ کی غلامی پہ کیوں رضا مند ہو گئے ہیں جب کہ ان کا دین ان کے لیے کفایت کرتا ہے اور صرف وہی ان کی قوت کا منبع ہے۔ اور امریکہ ویورپ سے بھی ہمیں گلہ ہے کہ وہ کیوں ہمیں غلام بنانے پہ تلے ہوئے ہیں اور اس کے لیے ہر طرح کے حربے اور سازشیں روا رکھتے ہیں جب کہ انہیں اپنے آپ تک محدود رہنا چاہیے اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔

ہم مغرب کی 'سازش تھیوری' (Conspiracy Theory) کو بھی مغرب کی ایک سازش سمجھتے ہیں۔ اس نے مخالفین کے اس موقف کو کہ 'اہل مغرب ان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں' اس طرح تواتر سے اور مضحکہ خیز بنا کر پیش کیا ہے کہ اب اگر کوئی مغرب کی سازشوں کا ذکر کرے تو لوگ اسے غیر علمی رویہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ چھوڑیئے اس بات کو، یہ تو 'سازش تھیوری' پر مبنی ہے۔ یوں مغرب نے 'سازش تھیوری' کو اس طرح Ridicule کر دیا ہے کہ اب تحقیق وتجزیہ کرنے والے لوگ اہل مغرب کی سازشوں کا ذکر کرنے سے کتراتے ہیں۔ گویا مغرب اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتا بھی ہے لیکن چاہتا ہے کہ کوئی اسے سازشی نہ کہے۔

خلاصہ یہ کہ پہلے ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہیے اور اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں سے سبق سیکھنا چاہیے اور اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ ہی مغربی سازشوں کو بھی سمجھنا چاہیے اور ان کا رد بھی کرنا چاہیے۔

اچھا لباس آپ کی شخصیت کو بدل دیتا ہے
لیکن
اچھا اخلاق آپ کی پوری زندگی کو بدل دیتا ہے

شذرات

طالبان سے مذاکرات کو کامیاب بنایا جائے

حکومت اور ملک کی سیاسی جماعتوں نے طالبان سے مذاکرات کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ خوش آئند ہے اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مذاکرات کو کامیاب بنایا جائے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل امور اگر پیش نظر رکھے جائیں تو شائد معاملات بہتری کی طرف جا سکیں:

۱۔ مذاکرات کو سنجیدہ لیا جائے اور نتیجہ خیز بنایا جائے۔ انہیں مجاہدین کو طول طویل بحثوں میں الجھا کر انگیج کرنے، مصروف رکھنے اور وقت گزاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

۲۔ اس سلسلے میں غیر ملکی دباؤ قبول نہ کیا جائے اور آزادانہ فیصلے کیے جائیں بلکہ اس دباؤ کو نیوٹرل کرنے کا بھی سوچا جائے جو خود طالبان پر اس حوالے سے پڑ سکتا ہے تاکہ وہ بھی معقولیت کا راستہ اختیار کریں۔ [ہم یہ شذرہ لکھ چکے تھے کہ ایک تازہ حملے میں پاک فوج کے میجر جنرل شہید ہو گئے جس کی ذمہ داری 'طالبان' نے قبول کر لی۔ ہماری رائے میں یہ بھی ان غیر ملکی طاقتوں کی سازش ہے جو ان مذاکرات کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتیں اور دانش وحکمت کا تقاضا ہے کہ تحمل، بردباری اور حکمت سے اس طرح کی سازشوں کو ناکام بنایا جائے۔ جو لوگ ان مذاکرات کی مذمت کرتے ہیں یا انہیں ناکام دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ اگر امریکہ جیسی سپر پاور ویت نام میں کامیاب نہیں ہو سکی، امریکہ و روس دونوں افغانستان میں کامیاب نہیں ہو سکے اور خود پاک فوج آج تک ان 'مجاہدین' کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور اس میں ۳۵ ہزار سول اور ۵ ہزار فوجی شہید ہو چکے ہیں تو یہ تیس مار خان اور عقل مند کس برتے پر پھر پاک فوج کو ان سے لڑانا چاہتے ہیں؟]

۳۔ طالبان کا فاٹا اور وزیرستان میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے اور انہیں ٹالنے، ٹرخانے اور نمائشی اقدامات کے ذریعے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کی جائے جس طرح پہلے سوات میں کی گئی کہ موجودہ کورٹس کو قاضی کورٹس کا نام دے دیا گیا اور ضلع کچہری کو دارالقضاء کا بلکہ ان کے ساتھ دیانت داری برتی جائے۔ ان کے علاقے میں اقتدار مقامی لوگوں کو منتقل کیا جائے اور وہاں اسلامی شریعت کے نفاذ کے اقدامات باہمی مشورے سے کیے جائیں۔

اس سلسلے میں ملی مجلس شرعی کے زیر انتظام سارے دینی مسالک کے ۷۵ ممتاز علماء کرام نے پاکستان میں نفاذِ شریعت کے جو متفقہ ۱۵ نکات تجویز کیے ہیں، انہیں بھی پیش نظر رکھا جائے

تا کہ 'طالبانائزیشن' یا کسی ایک تعبیرِ شریعت، فقہی مسلک یا کسی مخصوص نقطۂ نظر کو دوسروں پر ٹھونسنے کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔

۴۔ ڈرون حملوں کے ذریعے معاملات کو سبوتاژ ہونے سے بچایا جائے۔ سلامتی کونسل میں فوری طور پر جایا جائے۔ ویسے بھی ہمارا خیال ہے کہ حکومت اگر جرأت کرے اور امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے تو ڈرون حملے رک جائیں گے لیکن اگر ہم خود ہی بھیگی بلی بنے رہیں، جیسا کہ پچھلے ایک عشرے سے بنے ہوئے ہیں، تو ظاہر ہے امریکہ تو شیر بنا رہے گا۔

۵۔ اگر طالبان پاکستان بھر میں نفاذِ شریعت کا مطالبہ کریں تو اسے بھی رد نہ کیا جائے بلکہ اس کے لیے بھی ضروری اقدامات بتدریج کرنے کی حامی بھر لی جائے کیونکہ یہ نہ صرف پاکستان کے مسلمان عوام اور دینی عناصر کا مطالبہ ہے بلکہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کا تقاضا بھی ہے جبکہ حکومت مسلم لیگ کی ہے۔ ویسے بھی ایسا کرنے سے حکومت کو عوام میں بہت پذیرائی ملے گی اور اسے بہت زیادہ سیاسی فائدہ ہوگا۔

۶۔ حکومت نے آل پارٹیز کانفرنس میں بڑی چابکدستی سے یہ ایشو نہیں اُٹھنے دیا کہ مسئلے کی جڑ یہ ہے کہ پاکستان امریکہ کی مسلط کردہ جنگ سے باہر آئے۔ تاہم اب امریکہ چونکہ خطہ چھوڑنا چاہتا ہے اس لیے حکومت پاکستان کے پاس Face saving کا سامان موجود ہے اور وہ طالبان کو یقین دلا سکتی ہے کہ وہ مستقبل میں خطے میں امریکہ کی بالادستی تسلیم نہیں کرے گی۔

طالبان کے ساتھ مذاکرات کو بہر قیمت کامیاب بنانا ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو لڑائی کا سلسلہ نہیں رکے گا اور حکومت کو یاد رکھنا چاہیے کہ گوریلا جنگ اور دہشت گردی کی کارروائیوں پر بزور بازو قابو نہیں پایا جا سکتا خصوصاً اس صورت میں جب ان کی حمایت کے لیے دشمن موجود ہیں۔ چالیس ہزار پاکستانی پہلے ہی اس نامراد جنگ کی نظر ہو چکے ہیں اور ملک کی معیشت برباد ہو چکی ہے لہٰذا اس منحوس لڑائی کو حکومتی رِٹ کے نام پر جاری رکھنا حماقت ہوگی۔

تعلیم و تربیت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی ☆

نئی نسل کے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے اسلامی اسکول قائم کیے جائیں ☆☆

نئی نسل کی ضرورت دینی مدارس سے پوری نہیں ہو رہی

ہمارے دینی مدارس سے پوری قوم کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہماری اٹھارہ کروڑ کی قوم کے کتنے فیصد بچے دینی مدرسوں میں آتے ہیں۔ باقی بچے کہاں جاتے ہیں؟ یقیناً وہ اسکولوں میں جاتے ہیں۔ سب کو نہ عالم بنانا ضروری ہے، نہ سب کو بنانا فرض عین ہے، فرضِ کفایہ کی حد تک علماء کی تعداد مدرسوں سے تیار ہوسکتی ہے۔ یہ جو پوری قوم اسکولوں کے ذریعے پروان چڑھ رہی ہے، جس ماحول میں یہ تعلیم حاصل کر رہی ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارا سرکاری تعلیمی نظام عملی طور پر سیکولر بلکہ ناکارہ ہو کر رہ گیا ہے۔ دین کا نام تو برائے نام بھی اب مشکل ہی سے آتا ہے۔ اور دین کا ماحول تو وہاں ہے ہی نہیں۔ دین سکھانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لیے اس قوم کی نئی نسل کو مسلمان رکھنا اب ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے۔ ورنہ ہمارا میڈیا، سرکاری اسکولوں اور تعلیمی اداروں کا ماحول نہ صرف یہ کہ سچے پکے مسلمان تیار نہیں کر رہا بلکہ اس نے ان کے ایمان کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ اس نسل کے دین وایمان کی حفاظت کا کوئی ذریعہ سوائے اس کے نظر نہیں آتا کہ یہاں بہت بڑی تعداد میں محلہ محلہ، قریہ قریہ، شہر شہر اسلامی اسکول قائم کیے جائیں۔

اسلامی اسکول تعلیمی نظام کی اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں

میں برسوں سے امریکہ و کینیڈا، برطانیہ اور یورپ کے ممالک میں وہاں کے مسلمان بھائیوں سے یہ عرض کرتا رہا ہوں کہ یہاں درسِ نظامی کے مدرسے کچھ قائم ہو گئے ہیں، مزید ایک دو مدرسے اور قائم ہو جائیں لیکن جو نسل ان ممالک کے کافرانہ فسق و فجور اور کفر و شرک کے ماحول میں پروان چڑھ رہی ہے ان کے دین وایمان کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہے کہ اسلامی اسکول قائم کیے جائیں۔ لیکن یہ بات ہم پہلے باہر کے ملکوں میں کہا کرتے تھے، اب ہمارے وطنِ عزیز میں تعلیمی نظام عملی طور پر اتنا سیکولر ہو کر رہ گیا

☆ رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی

☆☆ جامعہ کے جدید تعلیم کے شعبے'حراء فاؤنڈیشن'سکول کے جلسے سے خطاب

ہے کہ ان اسکولوں میں رہ کر ایمان و دین کی حفاظت بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔اس واسطے اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری قوم پورا زور اسلامی اسکول قائم کرنے پر لگائے اور جن کو اللہ تعالیٰ نے وجوہِ خیر میں خرچ کا موقع عطا کیا ہے وہ اس مد میں بھی خرچ کرنے کا اہتمام کریں اور اسلامی اسکول قائم کریں۔اسلامی اسکول کا مطلب حراء فاؤنڈیشن جیسے اسکول ہیں۔الحمدللہ آپ نے دیکھا کہ یہاں انگریزی زبان کو بھی مسلمان بنا دیا گیا ہے اور عصری علوم فنون کو مشرف با سلام کر کے پڑھایا جا رہا ہے۔

دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم میں کوئی تفریق نہیں

اسلام میں ویسے بھی دینی تعلیم اور دنیا کی تعلیم کی تفریق کبھی نہیں رہی۔تمام مسلم ممالک کی تاریخ، پوری امت کی تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ دین و دنیا کی تعلیم میں کبھی تفریق نہیں رہی۔یہ تفریق تو انگریزوں کے دور میں پیدا ہوئی جب انہوں نے ہمارے دینی مدارس کا بائیکاٹ کیا اور اسکولوں میں دین کا بائیکاٹ کیا۔اس وقت علماء کو یہ ضرورت پیش آ گئی کہ دینی مدرسوں کو قائم کریں،جن میں دین کی تعلیم کی حفاظت کریں اور تربیت کریں لیکن آزاد پاکستان بن جانے کے بعد یہاں ضرورت اس بات کی تھی کہ پورے ملک کا نظام ایسا ہو کہ ایک حد مثلاً میٹرک تک تمام اسکولوں اور تمام تعلیمی اداروں میں نظامِ تعلیم یکساں ہو۔اور اس کے بعد تمام علوم وفنون کے ماہرین الگ الگ شعبوں میں تیار ہوں۔عربی کے ماہرین،قرآن وسنت کے ماہرین پیدا کرنے کے لیے ان مدرسوں اور دارالعلوموں کا رُخ کیا جائے۔ اور دوسرے مضامین میں مہارت پیدا کرنے کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رُخ کیا جائے۔ ہمارے والد صاحبؒ جو جامعہ دارالعلوم کراچی کے بانی ہیں،اور دوسرے بزرگوں نے پاکستان بننے کے وقت سے بہت کوشش کیں لیکن اُس طبقے نے ان کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا جو یہاں سیکولر نظام تعلیم کو مسلط کرنا چاہتا تھا۔اس لیے دینی مدرسے الگ قائم کیے گئے۔الحمدللہ ان دینی مدرسوں کے ذریعے قرآن وسنت کے علوم نہ صرف محفوظ ہو گئے ہیں بلکہ الحمدللہ ان میں مزید ایسا تحقیقی کام ہوا ہے جو عرب ممالک کے لیے بھی قابلِ تقلید ہے۔عرب ممالک میں جائیں تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ دین کا علم اگر ہے تو انڈیا و پاکستان میں ہے۔

ہمیں ہر صنعت میں خود کفیل ہونا ہے

مگر اس پود کا کیا ہوگا۔ یہ نئی نسل جو تیار ہو رہی ہے انہیں ہم جاہل بھی نہیں رکھ سکتے۔ ان سب کو عالمِ دین بنانے کے لیے درسِ نظامی میں داخل بھی نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے کہ سب کو درسِ نظامی میں داخل کرنا بھی نہیں چاہیے۔ آخر ہمیں مسلمان انجینئروں کی بھی تو ضرورت ہے۔ ہمیں مسلمان ڈاکٹروں کی بھی تو ضرورت ہے، ہمیں مسلمان سائنسدانوں کی بھی تو ضرورت ہے۔ معیشت کے مسلمان ماہرین کی بھی ضرورت ہے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر دو صحابہ کرام صرف اس وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکے تھے کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام بھیجا ہوا تھا تا کہ وہ دبّابہ کی صنعت سیکھ کر آئیں، منجنیق کی ٹیکنالوجی سیکھ کر آئیں تا کہ مسلمان حربی صنعت میں خود کفیل ہوں۔ تو یہ دین و دنیا کی تفریق ہماری تعلیم میں نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر پکا مسلمان ہو، سچا مسلمان ہو۔ اسی طرح ہر انجینئر اور سائنسدان پکا سچا مسلمان ہو۔ یہ دین کی ضرورت ہے اور یہ سب دین کے راستے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے اتنے راستے ہیں جتنی مخلوقات کے سانسوں کی تعداد ہے

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کے راستے صرف تین ہیں۔ یا تو اپنے بچے کو مدرسے میں داخل کر دو یا جہاد میں بھیج دو یا تبلیغ میں بھیج دو۔ بلاشبہ یہ دین کے بہت بڑے اور اہم راستے ہیں لیکن دین کے راستے ان تین میں منحصر نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں جتنی مخلوقات کے سانسوں کی تعداد ہے۔ تجارت بھی ایک ذریعہ ہے۔ معیشت بھی ایک ذریعہ ہے۔ زراعت بھی ایک ذریعہ ہے۔ ٹیکنالوجی بھی ایک ذریعہ ہے، سائنس بھی ایک ذریعہ ہے۔ تعمیری اور مخلصانہ سیاست بھی اہم ذریعہ ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام علوم وفنون کو مشرف باسلام رکھا جائے اور ان علوم وفنون کو مسلمان بنا کر مسلمانوں کو پڑھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

غریب طلبہ کے لیے اسلامی اسکولوں کو زکوٰۃ کا نظام قائم کرنا چاہیے

میں تو یہ عرض کرتا ہوں کہ اب اسکول تو بہت قائم ہو گئے ہیں لیکن اسلامی اسکول نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہم سے لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم فلاں جگہ رہتے ہیں، ہم اپنے بچے کو ایسے ماحول میں داخل کرنا چاہتے ہیں جہاں ہمارا بچہ مسلمان رہے۔ آس پاس میں کوئی مدرسہ نہیں ہے۔ دور بھیجنے کی ہمت اس لیے نہیں ہے کہ حفاظت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور جن اسکولوں میں اسلامی ماحول کے مطابق نظامِ تعلیم موجود ہے، ان کا چونکہ کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں لہٰذا ان کے ہاں فیسیں بھاری ہیں۔ غریب آدمی اس فیس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں برطانیہ میں پچھلی مرتبہ یہ کہہ کر آیا کہ خدا کے لیے غریب طلبہ کے لیے

آپ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں۔جس طرح سے آپ دینی مدرسوں کے لیے زکوٰۃ کے پیسے دیتے ہیں، اسی طرح ان اسلامی اسکولوں کے ایسے بچوں کے لیے زکوٰۃ کا راستہ نکالیں تا کہ وہ بچے دوسرے مالدار بچوں کے برابر فیس دے کر تعلیم حاصل کر سکیں اور احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔

اسکول کے طلبہ بھی زکوٰۃ کا مصرف ہو سکتے ہیں

وہاں مجھے یہ بتایا گیا کہ بعض لوگوں نے یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ ان اسلامی اسکولوں میں زکوٰۃ دینا جائز ہی نہیں، یہ بچے خواہ کتنے بھی غریب ہوں انہیں زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔بھئی ان کا کیا جرم ہے؟ اگر وہ اسکول میں پڑھ رہے ہیں، دینی ماحول میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، انگریزی کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، سائنس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اگر وہ غریب ہیں تو بلاشبہ وہ مصرفِ زکوٰۃ ہیں۔تو میری تجویز ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ تجویز آگے بڑھانے کی توفیق دے، کہ ان اسکولوں میں غریب طلبہ کے لیے بھی راستہ نکالا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اہل ثروت حضرات مستحق طلبہ کے لیے ان مدرسوں میں زکوٰۃ کا فنڈ قائم کریں، تا کہ غریب بچے بھی اس فنڈ سے ایسی ہی اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کریں، اور ان کے پاس بھی ایسے ہی یونیفارم ہوں، ایسی ہی کتابیں ہوں اور ایسی ہی فیس انہی بچوں کے ہاتھوں سے دلوا دی جائے تا کہ ان کے اندر یہ احساسِ کمتری نہ ہو کہ ہم فیس ادا نہیں کر رہے، فیس بھی وہ ادا کریں۔ایک کھڑکی سے ان کے سرپرستوں کو پیسے دیئے جائیں دوسری کھڑکی سے وہ بچے خود فیس ادا کریں۔

اس طرح ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری یہ تعلیم نئی نسل کے دین و ایمان کی حفاظت کا ذریعہ ہو سکے گی۔

(البلاغ جولائی ۲۰۱۳)

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

تعلیم و تربیت

انجینئر مختار فاروقی ☆

تعلیم کا مسئلہ اور اس کا حل

نصاب مدنیؒ والبرہان کے تعلیمی نظریات پر ایک تبصرہ

۱۔ ماہنامہ 'البرہان' لاہور کے حالیہ شماروں میں مسلمانوں کے ہاں جاری دو نظام ہائے تعلیم کے سلسلے میں بعض اکابرین کی مدلل آراء اور اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے بطل جلیل مولانا حسین احمد مدنیؒ کی تعلیمی و تدریسی اصلاحات پر مبنی ایک تحریر شائع ہوئی جو صاف ظاہر ہے پاکستان کے قیام سے قبل کی ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں ماہرین تعلیم میں سے جو دین کا درد بھی رکھتے ہیں، ان کے ہاں یہ بحث گزشتہ ڈیڑھ صدی سے جاری ہے کہ عصر حاضر میں اسلام کے تعلیمی اُصولوں کو سامنے رکھ کر کیا نظامِ تعلیم بنایا جائے تاکہ مسلمانوں میں علم دین کی بنیادی اور ناگزیر تعلیم جاری رہے اور اسلام کے فروغ اور غلبے کے لئے جذبہ اور جوش بھی باقی رہے نیز اس جدوجہد کے لیے باصلاحیت رجالِ کار بھی فراہم ہوتے رہیں۔ ایسا نظامِ تعلیم سیاسی و خارجی حالات سے کم سے کم تأثر قبول کرے اور مسلمانوں کی فکری آبیاری اور نظریاتی تسلسل کا باعث بھی بنے۔ مگر تمام تر خلوص و اخلاص، سعی و محنت، تحقیق و جستجو اور دُعاؤں کے باوجود، تاحال مشرق و مغرب کے مسلمان کوئی اُصولی عالمی اسلامی نظامِ تعلیم وضع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

۳۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک مؤثر وجہ جدید تعلیم یافتہ مخلص اہل علم اور قدیم وروایتی علماء کے مابین فی نفسہٖ 'مسئلہ تعلیم' کی عصر حاضر میں ضرورتوں، تقاضوں اور اس کی تنفیذ کے طریقوں اور ضابطوں کے بارے میں 'تنقیحات' کی کمی ہے جس خلوص سے ہر 'مصلح' اپنی کوششوں کی بنا جن معلومات، مفروضات، خدشات، ماحول کے تقاضوں اور نتائج پر رکھتا ہے وہ اسی طرح سے کسی دوسرے لکھنے والے کے 'معہودِ ذہنی' سے کہیں مختلف ہوتے ہیں اور یوں بات نتیجہ خیز نہیں ہو پاتی۔

اس ضمن میں راقم کوئی فیصلہ کن رائے دینے اور کسی کامیاب 'بیچ کی راہ' دکھانے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ تاہم درج ذیل سطور میں اس عنوان پر چند غیر شعوری مفروضات اور خدشات کا

تذکرہ اور تصریح ضروری سمجھتا ہے تاکہ قارئین اور اہل علم اس کی روشنی میں اپنی کاوشوں اور Decision Making کو نتیجہ خیز بنا سکیں اور خلط مبحث سے ممکنہ حد تک دُور رہا جا سکے۔

☆ مدیر ماہنامہ حکمت بالغہ، جھنگ و ناظم اعلیٰ تحریک خلافت، لاہور

۴۔ قارئین کرام! وہ چند اہم امور بیانیہ انداز میں درج ذیل ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ ان سطور کے مطالعہ سے ہم 'نفس مسئلہ' کو زیادہ واضح طور پر دیکھ سکیں گے، مسائل و مشکلات و موانعات کا بہتر انداز میں میں تعیّن کر سکیں گے اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو بہتر نتائج بھی برآمد ہوں گے۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ کے بعد جب دنیا کے بہت سے علاقوں میں بنی اسرائیل سے باہر علیحدہ علیحدہ نبی آنے بند ہو گئے (القرآن ۲۵:۲۷) اور دوسری طرف انسان نے ترقی کر کے علم کو محفوظ کرنے کے لئے لکھنے کو رواج دیا، کاغذ تیار کیا اور صحیفے اور کتابیں وجود میں آنے لگیں تو بعض قدیمی مذاہب (ہند، چین، ایران وغیرہ) میں اپنے مذہب کو محفوظ رکھنے کے لئے مذہبی تعلیم کا رواج ہوا اور دنیاداری سے دور سیاسی عروج و زوال سے لاتعلق ہو کر مذہبی تسلسل کے لئے یہ نظام ایجاد ہوئے اور چلائے گئے۔

اسی دور میں بڑی بڑی وسیع حکومتوں کا تصوّر آیا اور شاہی خاندان آئے جنہوں نے کئی کئی صدیاں حکومت کی۔ مذہبی حکومت ہوا اور انصاف کی عملداری ہو تو حکمران بے غرض اور لالچ سے پاک ہوتے ہیں مگر جب خاندانی حکومتیں آئیں اور اس کے ساتھ 'جوعُ الارض' وسائل پر قبضہ اور شاہی خاندانوں کے لئے بے تحاشا آسائشیں جمع ہونے لگیں تو اہرامِ مصر، یونان، ایران اور عراق کے شاہی محلّات اور ان کے تکلّفات سامنے آئے اور حکمرانوں نے اپنی حکومتوں کو دوام بخشنے کے لئے اور ہر ممکن طریقے پر اپنی عیاشی کے تسلسل کی خاطر حکومت کی بقا کے لیے جبر اور استبداد کے طریقے نکالے اور اس کو قانون کا درجہ دیا۔ پھر اس کالے قانون کے نفاذ اور عوام پر تشدد، جبر، استحصال کے لئے نمائشی عدالتیں بنیں، جج بنے، شاہی فرمان اور بعض جگہوں پر سرداروں اور حکمرانوں کے منظورِ نظر لوگوں نے اکٹھے بیٹھ کر بادشاہوں اور اپنے مالی مفادات کے تحفظ اور استحصال کے نظام کو دوام دینے کے لئے 'سینٹ' اور 'مشاورت' کے نظام بنائے۔ اسی غرض کے لئے اور اپنی حکومت میں توسیع کے پیش نظر فوجیں کھڑی کی گئیں اور مسلح افواج (ہمہ وقتی فوج یا Standing Armies) کا تصور آیا۔ جو ہمہ وقت سپاہی ہوتے تھے، ان کو اسلحہ سے لیس کر دیا گیا جس کے لئے انہیں سر کے خود Helmet سے لے کر پاؤں کے جوتے تک لوہے میں ملبوس کر دیا گیا اور یہ فوجیں جہاں جاتیں لوٹ مار کرتیں، عزتیں پامال کرتیں، قتل و غارت کرتیں اور یوں اپنے ان افعال سے اپنے حکمران اور بادشاہ کی عیاشی کے لئے وسائل فراہم ہوتے اور ان کے دوام کے لئے

حکومت کو بقاء واستحکام میسر آتا۔

ان مستبد اور جابر وقاہر حکمرانوں نے بھی اپنے لئے نظامِ تعلیم رواج دیا اور یہ طرزِ عمل بعد کے ہر ظالم و جابر اور استحصالی طرزِ حکومت کے لئے مثالی بن گیا۔ یہ نظامِ تعلیم حکومت اور شاہی خاندان کیلئے عدلیہ اور فوج میں سرکاری اہل کار فراہم کرنے کے لئے وجود میں لائے گئے۔ ایسی حکومتوں میں چین کے 'ھن'، روم کے 'قیاصرہ' رومی بادشاہ، ایران کے کئی خاندان، یونانی حکمران اور جدید مغربی یورپی حکومتیں سب ایک سوچ کی حامل ہیں۔

ایسی حکومتوں کے تحت ان تعلیمی نظاموں میں کسی مذہبی تعلیم، اخلاقیات، آدابِ زندگی اور عوام کے حقوق کا لحاظ کرنا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اُنہوں نے ہر ممکن اور قابلِ عمل طریقے سے اپنے مخالفین اور دشمنوں کو ستایا، پریشان کیا، عذاب دیے، زندہ بھوکے شیروں کے سامنے ڈال کر دل کی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ لہٰذا ان حکومتوں کے نظام ہائے تعلیم میں مذہب دشمنی، وحی دشمنی، اخلاق دشمنی، انسان دشمنی، بے حیائی، لا اُبالی پن، حیوانیت اور بے مقصدیت سرفہرست ہیں اور مشترک ہیں اور انہیں اس پر فخر ہے۔

(ب) بنی اسرائیل کے درمیان اللہ تعالیٰ نے مسلسل کئی نبی بھیجے اور اس دین کو پھیلانے کے لئے جہاد کی تعلیم دی مگر اس گروہ نے حضرت موسیٰؑ کی موجودگی میں ہی جہاد سے انکار کر دیا۔ بعد میں وقفے وقفے سے (صدیوں بعد) حضرات انبیاء کرامؑ کی تشریف آوری پر جذبہ جہاد پیدا ہوا اور حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کی حکومتیں بنیں۔ عرصے بعد مکابی سلطنت بھی وجود میں آئی مگر مجموعی طور پر بنی اسرائیل اللہ کے دین کے علمبردار بن کر جس طرح ساری دنیا میں جہاد کرتے ہوئے پھیلنے چاہئیں تھے وہ اس کام کو نہ کر سکے۔

اسی لئے بنی اسرائیل نے اپنے دینی تسلسل کے لئے اپنی کتابوں تورات، زبور اور انجیل کو چھپا کر ایک خفیہ اور Under Ground نظامِ تعلیم وضع کیا جو یہود کے چوٹی کے علماء وغیرہ ہی جانتے تھے اور عوام کے لئے موجود بائبل تصنیف کر کے سامنے رکھ دی جس میں نبوت، رسالت، وحی، سیرتِ انبیاء کرام علیہم السلام کو داغدار کر دیا گیا ہے اور پڑھنے والا کسی جذبہ عمل سے روشناس نہیں ہوتا۔

بنی اسرائیل نے خود اقامت دین اور شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرنے کے لئے حکومتیں بنانے اور دین کے نفاذ کی کوششیں نہیں کیں (القرآن (۰۵:۶۸) حالانکہ ان کے تاریخی سرمایہ میں حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ جیسے حکمران ہوئے ہیں اور اپنے اس جرم کو چھپانے کے لئے اُنہوں نے رومیوں سے طرزِ حکومت اور قانون جبکہ یونانیوں سے بے دین فلسفہ اور نظامِ تعلیم سے لے کر آج سے چھ صدیاں قبل

ظالمانہ جبر و استحصال سے عالمی حکومت کے قیام کو ممکن بنا لیا۔ چنانچہ ماضی قریب میں لکھی گئی کتاب *Clash of Civilizations* (تہذیبوں کا تصادم) کا مصنف Semoil P.Hungtingon واضح طور پر لکھتا ہے:

> ''............۱۵۰۰ء سے ۱۷۵۰ء کے درمیانی عرصے میں پہلی عالمی سلطنت کو قائم کرنے میں مغرب والوں کی کامیابی کا دار و مدار ان کی جنگی استعداد میں اضافہ تھا، جس کو ''فوجی انقلاب'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ مغرب نے دنیا کو اپنے نظریات یا اقتدار یا مذہب میں برتری کی وجہ سے فتح نہیں کیا تھا بلکہ اس وجہ سے فتح کیا تھا کہ منظم تشدد کرنے میں اس کو برتری حاصل تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مغرب کے لوگ تو بھول جاتے ہیں لیکن غیر مغربی لوگ فراموش نہیں کرتے۔''
>
> (صفحہ ۴۱۔ تلخیص و ترجمہ: عبدالمجید طاہر)

(ج) یہ بات یاد رہے کہ حکومتیں جو نظامِ تعلیم جاری کرتی ہیں وہ ایک طرف حکومت کو اپنے جبر و استحصال کے دوام کے لیے اعلیٰ سرکاری عہدیدار اور فوجی کمان کے افسران اعلیٰ مہیا کرتا ہے اور ساتھ ہی تعلیم کے لئے اسی مزاج کے اساتذہ فراہم کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ اضافی طور پر اس نظامِ تعلیم سے معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد اور تعلیم یافتہ تاجر اور شہری مستفیض ہوتے ہیں اور نتیجتاً ایسے نظامِ تعلیم عروج و زوال کے آسمانی قانون کے مطابق حکومتوں اور تہذیبوں کے ختم ہونے پر از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال سپین (اُندلس، ہسپانیہ) یورپ میں مسلمانوں کی آٹھ صد سالہ حکومت (۷۱۱ء تا ۱۴۹۲ء) کے بعد وہاں مسلمانوں کا نیست و نابود ہو جانا ہے اور زوال کے بعد تمام حکومتی اداروں کا زمین بوس ہو جانا ہے۔

(د) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت عرب ایک غیر متمدن علاقہ تھا۔ تاہم فتوحات کے سلسلے کے آغاز پر ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی میں 'صفہ' کا مدرسہ جاری فرمایا اور ختم نبوت کے بعد اسلام کی تعلیمات کے، سیاسی عروج و زوال سے قطع نظر، جاری رہنے کا اہتمام کر دیا اور رہنمائی فرمادی۔ یاد رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دورِ مبارک میں بھی اس 'صفہ' سے کوئی سپہ سالار، حکمران یا مدبر پیدا نہیں ہوا۔ اعلیٰ درجے کے معلّم ضرور پیدا ہوئے اور جو بنیادی مقصد پیش نظر تھا غالباً وہ ضرور پورا ہو گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ دورِ خلافت راشدہ میں ان مقدس ہستیوں نے مسجد نبوی کے اس مدرسے کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کے مطابق جاری رکھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس مدرسے کے اجراء کے دو صدیوں بعد تک بھی یہاں سے کوئی حکمران اور سپہ سالار فارغ التحصیل ہو کر نہیں نکل سکا۔ ہاں علم دین کی حفاظت کا کام کرنے

والی شخصیات ضرور یہاں سے نکلیں اور اپنا فرض بطریق احسن سرانجام دیتی رہیں، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

(ھ) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور دورِ خلافت راشدہ میں اسلامی حکومت کے اہم عہدوں کے لئے موزوں افراد دو طرح سے سامنے آتے رہے:

(i) قبیلوں کے سردار جو اپنی حیثیت کی وجہ سے حکمرانی اور ثالثی و عدالت سے واقف ہوتے ہیں اور عوام سے معاملہ کرنے کا تجربہ رکھنے کی وجہ سے مفتوحہ علاقوں کی حکومتی ذمہ داریاں باحسن نبھانے کے لئے اہل سمجھے جاتے تھے اور اس ذمہ داری کو اکثر کامیابی سے نبھاتے رہے۔

(ii) دوسری طرف مسلمانوں کے ابتدائی دور میں 'فوج' رضا کارانہ تھی' حضرت عمرؓ کے دورِ مبارک میں فوج کا ادارہ (دیگر اداروں کی طرح) منظم کیا گیا تاہم مسلمانوں کی مسلح افواج (Standing Armies) کبھی بھی رومی اور ایرانی درجے کی تربیت کے معیار تک نہیں پہنچائی گئیں اس لئے کہ رومی فوجوں کے جو مقاصد اور طریق تربیت تھا وہ ان حکمرانوں کے قبیح اور مکروہ شیطانی مقاصد کے تابع تھا اور ایسے مکروہ ابلیسی مقاصد مسلمان حکمرانوں کے سامنے بالعموم کبھی بھی نہیں رہے۔

(iii) حکمران اپنے اور اپنی اولاد کی دینی تعلیم کے لیے موزوں اہل علم افراد تلاش کرتے اور بطور اتالیق مقرر کرتے اور اس طرح تعلیم دین کا کام اعلیٰ علمی افراد کی حکومتی سرپرستی کے ساتھ چلتا رہا۔ یہ نظام تعلیم شخصیات کے گرد ترقی پذیر رہا۔

(iv) عباسی حکومت کے تسلسل کے نتیجے میں

کئی صدیوں کے تعامل سے مسلمانوں نے حکومتی ضروریات کے لئے مدارس کا باقاعدہ نظام قائم کیا اور کامیابی سے چلایا۔ یہی نظام بعد میں دیگر مسلم حکومتوں نے بھی اپنایا۔ یہ نظام مسلمانوں کے دورِ عروج سے لے کر یورپی استعمار کے عروج اور عالم اسلام پر قبضے تک کامیابی سے ایک ہزار سال تک دنیا میں جاری رہا تا آنکہ مشرقِ وسطیٰ، شمالی افریقہ اور جنوبی ایشیا کے علاقوں میں یورپی طاقتوں نے خصوصی جبر و استحصال سے قبضہ کر کے اپنا نظامِ تعلیم جاری کر دیا۔ جنوبی ایشیا میں یہ نظامِ تعلیم ۱۸۳۵ء کے لارڈ میکالے کے نام سے موسوم ہے۔

(و) برطانوی ہند میں جدید مغربی نظام تعلیم کے نفاذ اور فروغ سے مسلمانوں کو اپنے علمی سرمائے کے تحفظ کی فکر دامن گیر ہوئی تو اُنھوں نے مغربی تعلیم اور اس کے فوائد و مراعات سے منہ موڑ کر صرف دین

کی خدمت کے جذبے سے دینی مدارس کے قیام کا راستہ اختیار کیا۔ دارالعلوم دیوبند ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا اور مسلمان اُمت کی ضرورت بن گیا اور جلد ہی اس کی شاخیں پورے ملک کے طول وعرض میں پھیل گئیں۔

(ز) یہ دینی مدارس اپنی فطرت کے اعتبار سے انگریز دشمن، انگریزی تہذیب وتمدن سے نالاں اور نتیجتاً انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لئے کوشاں رہے۔ اگرچہ عملاً آزادی کے حصول میں علی گڑھ کے جدید تعلیم یافتہ حضرات کا حصہ بھی کسی طرح کم نہیں تھا۔

(ح) مسلمان ماہرین تعلیم نے محسوس کیا کہ دیوبند اور علی گڑھ میں زمینی فاصلہ تو زیادہ نہیں مگر تعلیمی نظریات کی راہیں بالکل جدا ہیں اور اگر ایسا ہی سلسلہ جاری رہا تو مسلمان اُمت کے انتشار کا سبب بنے گا لہٰذا گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصہ سے ان دونوں نظام ہائے تعلیم کو قریب لانے، مدغم کرنے اور ثنویت کو ختم کرنے کے لئے کئی 'بیچ کی راہیں' تلاش کی گئیں، کئی ادارے قائم ہوئے، کئی شخصیات اس مشن کی داعی بنیں مگر تا حال کوئی کوشش کامیاب ہو کر مسلمان اُمت کے دل کی آواز نہیں بن سکی۔

پاکستان میں دینی مدارس کی موجودہ صورت

۵۔ اس طویل پس منظر کے بعد پاکستان میں دینی مدارس کی موجودہ صورت حال یہ ہے کہ گزشتہ تین عشروں میں ملک میں عرب ممالک سے پیٹرو ڈالر کی بے تحاشہ آمد، ملکی ترقی، تجارت کے فروغ اور علماء کرام کے بیرون ملک دوروں سے وہاں کے حالات سے واقفیت کے نتیجے میں ملک کے تمام معروف دارالعلوموں نے (جو تین عشرے پہلے تک کسمپرسی اور تنگی ترشی سے آمدن واخراجات کو برابر کرتے تھے) نہ صرف بہت ترقی کی ہے بلکہ وہاں پیسے کی ریل پیل ہے۔ ہر دارالعلوم نے مستقبل کے لئے اپنا وسیع کیمپس کا منصوبہ (۱۰ کروڑ، بیس کروڑ، ۲۵ کروڑ کے تخمینی اخراجات کے ساتھ) متعارف کرا رکھا ہے اور اکثر پہ کام بھی جاری ہے۔

اس کے ساتھ اکثر دارالعلوموں میں کراچی کے جامعہ رشیدیہ کے اتباع میں جدید علوم کے سکھانے بالخصوص کمپیوٹر کورسز کا رواج ہو چکا ہے اور طلبہ بالعموم کمپیوٹر سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے ہیں اور اس کا استعمال بھی جانتے ہیں اور کرتے ہیں (یعنی ان کے پاس کمپیوٹر بھی ہیں)۔

ان حالات میں پاکستان کے ان مدارس کا حال ہمارے نزدیک کچھ یوں ہے:

(i) جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا جب تک یہ مدارس صرف دین کے تحفظ کے لئے قائم تھے تو عوام کی امداد سے چلتے تھے اور اخراجات محدود تھے۔

(ii) جب سے مدارس میں جدید کورسز شروع ہوئے ہیں تو ان کے اخراجات میں بھی کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے (اگر چہ وہ اخراجات تا حال پورے ہو رہے ہیں) مگر ہر سرکاری نظامِ تعلیم کی طرح ان جدید مذہبی مدارس کے فارغ طلبہ کا مستقبل ایک سوالیہ نشان ہے۔حکومتی نظامِ تعلیم تو استوار ہی حکومتی ضرورتوں کے تحت ہوتے ہیں تا کہ ہر محکمہ اور شعبہ زندگی کے لیے معیاری افراد میسر آسکیں اور عام فوجی سے لے کر جنرل تک،کلرک سے لے کر سیکرٹری تک،تمام لوگ اسی نظام سے فراہم ہوتے ہیں۔ وہاں سے فارغ التحصیل کس کس شعبے ہائے زندگی میں جگہ پائیں گے۔اس کے لیے ادارے بنتے ہیں، نئے Jobs کے مواقع تلاش کیے جاتے ہیں۔مزید برآں لوگوں کو Job فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہمارے دینی مدارس کے طلباء کا مستقبل کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ رازق ہے مگر ان بے شمار اداروں کے طلباء کے لیے موزوں ذریعہ معاش کا پہلے سے فکر کرنا ضروری ہے مگر یہ ادارے چونکہ حکومتی کنٹرول اور منصوبہ بندی کا حصہ نہیں ہیں لہٰذا ان طلبہ کا مستقبل مخدوش ہی رہے گا۔کیا یہ طلبہ جدید انگریزی سکولوں اور کالجوں/یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ کا مقابلہ کے امتحانوں میں آمنا سامنا کر سکیں گے۔اگر نہیں تو پھر ان طلباء کا مستقبل کیا ہوگا؟

پہلے تو یہ طلباء مساجد کے خطیب امام،مؤذن اور بچوں کو ناظرہ پڑھانے کی ذمہ داریاں سنبھالتے تھے مگر اب جدید تعلیم کے ساتھ ان طلباء کا عملی زندگی میں مقابلہ مشکل ہے اور یہ طلباء مدارس اور معاشرہ پر بوجھ بنیں گے۔

(6) اسلامی حکومت کا قیام اور مدارس

اس صورتِ حال کی ایک اور مشکل یہ ہے کہ ہمارا ملک پاکستان اسلام کے عملی نفاذ کا منتظر ہے اور یقیناً جلد یا بدیر ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش گوئیوں اور فرامین کے مطابق اس ملک (اور پوری دنیا) میں اسلام کا نفاذ ہوگا۔اسلام کے نفاذ کے نتیجے میں دو اقدامات تو لازمی ہیں:

(i) نظامِ زکوٰۃ کا نفاذ: جس میں زکوٰۃ/صدقات اور عشر وغیرہ صرف حکومت اکٹھا کرے گی۔

(ii) مساجد اور نظامِ تعلیم کا حکومتی تحویل میں چلے جانا۔

اس کے اثرات درج ذیل ہوں گے:

☆ مدارس نیشنلائز (Nationlize) ہوتے ہیں تو حکومت جلد ہی انہیں دوسرے سرکاری اداروں کے مطابق سرکاری نصاب کے تابع کر دے گی اور یوں ان کی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔

☆ مساجد سرکاری تحویل میں جاتی ہیں تو علماء کا عوام سے رابطہ جواب ہے وہ اس طرح جاری نہیں رہ سکے گا اور پھر عوام سے صدقات اور عطیات کی وصولی کی کیفیت پہلے والی نہیں رہے گی جس سے موجودہ نظام مدارس و مساجد میں ایک نوعی اور بنیادی تبدیلی آجائے گی جو اس سارے نظام کو ہلا کر رکھ دے گی۔

۷۔ اس صورتِ حال میں ہمارے نزدیک دینی مدارس کے نظام کو صرف 'صفہ' تک محدود رہنا چاہئے اور دینی علوم اور دینی فکر کے تسلسل کا ذمہ دار ہونا چاہئے اور ان مدارس کو سیاسی اُتار چڑھاؤ اور آزادی و غلامی میں (بہار ہو کہ خزاں) اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔ جہاں تک بات جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ہے تو آنے والی اسلامی حکومت (اگر مخلص ہوئی تو) یقینا جلد ہی اپنے لئے اپنے وسائل سے نیا نصاب تعلیم وضع کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اور معاشرے کی ضروریات اور حکومتی وسائل کے مطابق لوگ اس نظام سے استفادہ کر کے عملی زندگی گزاریں گے۔ یہی نظامِ تعلیم ہے جو حکومت کے عدالتی نظام کے لئے ہر سطح کے اہل کار مہیا کرتا ہے۔ پولیس، محکمہ صحت، انجینئر نگ، زراعت، صنعتی شعبہ، فوج، الغرض ہر شعبہ زندگی کے افراد 'مسلمان' ذہن کے ساتھ اسی بدلے ہوئے نظام سے نکلیں گے اور اسلامی نظام کی گاڑی چلا کر دکھادیں گے۔ طالبانِ افغانستان اور ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

۸۔ سرکاری نظام تعلیم کو 'اسلامی' بنانے کی کوششوں کے سلسلے میں عام طور پر سکولوں کی سطح تک کام ہوا ہے اور وہ بھی حفظ قرآن یا ناظرہ قرآن کے ساتھ بچوں کو روزمرہ کی دعائیں یاد کرانے تک محدود ہے۔ عربی اور ترجمۃ القرآن پڑھائیں تو اضافی بوجھ بنتا ہے اور اضافی وقت چاہتا ہے جو جدید دور میں مسابقت کے حالات بچے اور ان کے والدین قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ نتیجتاً وہ منصوبے بے اثر ہو جاتے ہیں۔ عملاً ہمارے مجموعی معاشرتی ماحول میں جتنے فی صد اچھے باعمل نوجوان سکولوں، کالجوں سے برآمد ہو جاتے ہیں اس سے زیادہ تعداد ان خصوصی کاوشوں والے اداروں سے نہیں نکل سکتی گویا یہ ساری اضافی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ ایک ممکنہ قابل عمل کوشش جو اس سلسلے میں کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ اسی سرکاری نصاب کو ہی Rewrite کر کے پڑھایا جائے اور مغربی اداروں کی مطبوعہ کتب کی بجائے نئی تحریر شدہ کتابیں پڑھائی جائیں اور اہداف بھی وہی سرکاری ہوں، صرف درسی کتب کا انداز تحریر ایسا ہو کہ اس میں سے گذر کر بچے کے ذہن میں خدا کا تصور، انسان اور روح انسانی کا تصور، نیکی بدی کا احساس ...... ہدایت، آخرت کا تصور پیدا ہو سکے۔ انسان کے اندر وحی کی ضرورت اور انبیاء کرامؑ کی آمد اور ختم نبوت کا تصور اجاگر ہو سکے پھر اتباع رسول ﷺ اور اسلامی اصولوں کے مطابق سیرت و کردار کا احساس اُجاگر کیا جا سکے۔ مثلاً اسلامی تعلیمات کے مطابق سود حرام ہے مگر چھٹی کلاس یا اس کے بعد حساب کے سوالات میں سود ہی کے نام سے سوالات ہوتے ہیں۔ وہ بچہ یاد کرتا ہے، امتحان ہوتا ہے اور لفظ سود اس کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے گویا...... کاروبار اور منافع کا تصور ہی 'سود' پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر ان کلاسوں کے حساب کے نصاب سے 'سود' کا لفظ نکال کر منافع کا لفظ ڈال دیا جائے تو بچے کا ذہن 'سود' سے ناآشنا رہے گا اور اسلام

کی تعلیمات سامنے ہوں تو حرام بھی سمجھے گا۔

یہ کوشش ابھی تک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکی۔ تاہم ایک یہ ممکنہ راستہ ہے جس سے ہم موجودہ تعلیمی میدان میں اپنی آئندہ نسلوں کو سیکولرازم اور مغرب زدہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

البرہان اس بارے میں اپنا موقف ان شاء اللہ اگلے شمارے میں پیش کرے گا۔

مقالۂ خصوصی ڈاکٹر محمد امین

غلبۂ دین بذریعہ جمہوریت
مصر کے حالیہ تجربے کی روشنی میں

غلبۂ دین

ایک مجلس میں ایک بزرگ نے ایک دینی سیاسی جماعت کے متحرک ورکر سے پوچھا کہ آپ غلبۂ دین یا اقامت دین کے قائل ہیں؟ نوجوان نے جواب دیا: جی ہاں! یہ تو دین کی ایک بنیادی بات ہے۔ بزرگ نے پوچھا: آپ معاشرے میں دین کا غلبہ کیوں چاہتے ہیں؟ فرض کیجیے کہ دین غالب ہوگیا۔ اب آپ کیا چاہیں گے؟ نوجوان: ایک مسلمان کی آخری غایت تو یہی ہوتی ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہوجائے۔ کچھ توقف کے بعد اس بزرگ نے نوجوان سے پوچھا: کیا آپ نے کل پانچ وقت کی نماز جماعت سے ادا کی تھی؟ اس پر نوجوان خاموش ہوگیا۔ بزرگ نے کہا: باجماعت نماز ادا کرنا تعلق باللہ کا بنیادی ترین تقاضا ہے اور اس کا ترک معصیت ہے۔ تاہم باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی ضرورت ہے، امام کی ضرورت ہے، مسجد میں پانی اور بجلی کی ضرورت ہے۔ تو یہ سارے کام آپ اکیلے تو نہیں کرسکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ محلے کے دوسرے لوگ بھی نماز باجماعت پڑھنے کے خواہش مند ہوں، جو باہم مل کر مسجد بنائیں اور اس کا نظام چلائیں۔ نوجوان نے کہا: یہ صحیح ہے۔ اس پر بزرگ نے کہا کہ مسجد بنانے اور چلانے کے لیے حکومت کی منظوری اور معاونت بھی درکار رہے۔ اگر حکومت کو اپنی اقامت صلاۃ کی ذمہ داری کا احساس ہوگا تو وہ مسجد بنانے اور چلانے میں تعاون کرے گی، زمین کی رجسٹری کی منظوری دے گی، بلڈنگ کا نقشہ پاس کرے گی۔ بجلی اور پانی کا کنکشن دے گی......وغیرہ اور اگر خدانخواستہ سیکولر یا بے دین لوگوں کی حکومت ہوگی تو وہ مسجد بنانے کی اجازت ہی نہیں دے گی یا اس سے متعلقہ امور میں رکاوٹ ڈالے گی اور مسجد نہیں بن پائے گی اور نہ باجماعت نماز کا اہتمام ہوسکے گا۔

نوجوان نے کہا: یہ صحیح ہے۔

بزرگ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر نوجوان سے کہنے لگے: اچھا آپ فرما رہے تھے کہ آپ کا آخری مقصد اللہ کو راضی کرنا ہے تو آپ یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن آپ سے حساب لیں گے تو پہلے کس چیز کا حساب لیں گے۔ کیا یہ پوچھیں گے کہ آپ نماز پڑھتے تھے یا نہیں؟ یا یہ پوچھیں گے کہ اہل محلہ نماز کیوں نہیں پڑھتے تھے؟ یا آپ سے یہ پوچھیں گے کہ حکومت اقامت صلاۃ کی ذمہ داری ادا کرتی تھی یا نہیں؟ نوجوان نے جواب دیا۔ ظاہر ہے پہلے مجھ سے میری نماز کا ہی پوچھا جائے گا اور پھر دوسری باتوں کا۔ اس پر بزرگ نے کہا: بالکل ٹھیک۔ لیکن آپ مسجد میں جماعت سے نماز نہیں پڑھ سکتے جب تک آپ کے ساتھ دوسرے بھی نماز پڑھنے والے نہ ہوں اور جب تک حکومت آپ کو نماز کا نظام قائم کرنے کی اجازت نہ دے۔

نوجوان نے کہا: اس گفتگو کا ماحصل کیا ہے؟ بزرگ نے جواب دیا: بیٹا! ہم غلبۂ دین اور اقامت دین کی بات کر رہے تھے۔ تو اس گفتگو سے اور نماز کی مثال سے یہ واضح ہو گیا کہ اصل چیز ہے اللہ کو راضی کرنا اور اس کی پہلی سیڑھی یہ ہے کہ فرد خود اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے۔ اس کی دوسری سیڑھی یہ ہے کہ فرد گلی محلے، خاندان، شہر اور معاشرے کے لوگوں کو بھی اللہ کی عبادت واطاعت میں اپنے ساتھ ملا لے اور اس کی تیسری سیڑھی یہ ہے کہ حکومت بھی ایسی ہو جو عبادت واطاعت میں فرد کی ہمنوا اور معاون ہو۔ گویا غلبۂ دین کے تین بڑے محور ہیں: ۱۔فرد، ۲۔معاشرہ اور ۳۔ ریاست۔ اللہ کے حضور جواب دہ فرد نے ہونا ہے معاشرے اور ریاست اور کسی تحریک یا جماعت نے نہیں، لہٰذا فرد ہی کی اصلاح بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اہم تر ہے اور اسی پر زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ معاشرے اور ریاست کا کردار بھی اہم ہے کیونکہ ان کی مدد کے بغیر فرد کا اللہ کی عبادت واطاعت کے رستے پر چلنا اور اس پر ثابت قدم رہنا مشکل ہے۔

اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرد اگر اللہ کی عبادت واطاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ دنیا میں بھی کامیاب ہے اور آخرت میں بھی، اور اصل کامیابی تو آخرت ہی کی ہے، خواہ معاشرہ اور ریاست اسلام کے راستے پر نہ بھی چلیں۔ اس کے بعد اگر معاشرہ فرد کی عبادت واطاعت کے رویے میں معاون ہو تو فرد کو بھی استقامت ملے گی اور خیر پر فرد اور معاشرے کے اجتماع کے نتیجے میں ریاست بھی غالباً ان کا ساتھ دے گی۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو تو بھی زیادہ نقصان نہ ہوگا۔ لیکن فرد اور معاشرے کی اصلاح کے ساتھ ریاست کی اصلاح کی کوشش بہرحال ضروری ہے تاکہ اس کا

وزن بھی حق کے پلڑے میں پڑے کیونکہ ریاست کی اہمیت اور موثر ہونا ظاہر و باہر ہے اور اس کے مخالف سلام ہونے کے نقصانات بھی واضح ہیں۔

سیاسی نظام کی بحث

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہے کہ غلبۂ دین کے حوالے سے بنیادی اہمیت فرد کو حاصل ہے اور اس کے بعد معاشرے کو اور پھر ریاست کو؛ لیکن فرد اور معاشرے کے دین پر عامل رہنے کے لیے انہیں ریاست کی سپورٹ درکار ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ریاست کا نظام ایسا ہو جو اسلامی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرے۔ سوال یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں ایک مسلم ریاست کا ایسا سیاسی نظام کس طرح وضع کیا جائے؟ یہاں ہماری بحث اصولی اور کتابی مرحلے سے گزر کر واقعاتی اور عملی مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب مسلم ممالک آزاد ہونا شروع ہوئے تو اس وقت ان کے سامنے یہ سوال آیا کہ ان کا سیاسی اور حکومتی نظام کیا ہو کیونکہ خلافت تو ۱۹۲۴ء میں ختم ہو چکی تھی۔

اُس وقت کے مسلم معاشرے میں تین طبقات نمایاں تھے:

۱۔ مسلم اشرافیہ خصوصاً سول و فوجی بیوروکریسی اور سیاستدان جو استعمار کے تربیت یافتہ تھے، مغربی تہذیب کے خوگر اور رسیا تھے اور ملک چھوڑ کر جانے والی استعماری قوتوں کی خواہش کے مطابق مغربی جمہوریت و سیکولرزم و نظام سرمایہ داری پر مبنی اس کے قائم کردہ سیاسی و انتظامی ڈھانچے کو جاری رکھنے کے لیے تیار تھے۔

۲۔ وہ دینی طبقہ جس نے مغربی استعمار کی مسلح مزاحمت کی تھی اور جسے کچل کر استعمار نے ملک پر قبضہ کیا تھا۔ وہ جانے والی استعماری قوتوں سے تعاون پر تیار نہ تھا۔

۳۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسلم معاشروں میں ابھرنے والی نئی دینی تحریکیں جن کے بانی اور قائدین روایتی علماء نہ تھے بلکہ جدید تعلیم یافتہ اسلامی سکالر تھے جیسے مصر میں اخوان المسلمون اور برصغیر میں جماعت اسلامی ......وغیرہ۔

پہلا طبقہ صرف اسلام کا لیبل لگا کر مغربی تہذیب پر مبنی اس نظام کو جاری رکھنے کا خواہش مند تھا اور اس کام کے لیے استعماری قوتیں اس کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ تیسرے طبقے کے علماء و مفکرین نے یہ جاننے کے باوجود کہ کوئی سیاسی نظام محض سیاسی نظام نہیں ہوتا بلکہ عقیدے، تہذیب اور ورلڈ ویو کا جز و اور

اس کی پیداوار ہوتا ہے اور یہ کہ جمہوریت مغربی تہذیب کے سیکولرزم، نیشنلزم، ہیومنزم اور کیپٹل ازم جیسے ملحدانہ افکار اور نظامِ حیات کی پیداوار ہے، اس جمہوریت میں بعض اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے دیا اور یہ توقع باندھ لی کہ اس کے ذریعے اقتدار حاصل کر کے وہ سیاست اور معاشرے کے دیگر شعبوں کو بھی اسلامی اصولوں پر ڈھال لیں گے۔ رفتہ رفتہ طبقہ دوم کے روایتی علماء بھی اس سیاسی نظام کو قبول کر کے اس کا حصہ بن گئے۔ اس اجتہادی فیصلے یا تجربے کو تقریباً پون صدی گزر چکی ہے اور اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس کے نتائج کا تجزیہ کر سکیں۔ ہمارے تجزیے کے مطابق اس کے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آئے ہیں:

۱۔ اکثر جگہوں پر استعماری قوتوں نے اپنے ایجنٹ مسلم حکمرانوں سے مل کر ایسے حالات پیدا کیے کہ اسلامی جماعتوں کو سیاسی میدان میں کامیاب نہیں ہونے دیا بلکہ بہت سے ممالک میں ان کو صحیح طرح سے کام ہی نہیں کرنے دیا، ان پر پابندیاں لگائیں، انہیں خلاف قانون قرار دیا، تعذیب سے گزارا، جیلوں میں ڈالا......وغیرہ۔ افریقہ، یورپ، مشرق وسطی، مشرق بعید، جنوب مشرقی ایشیا اور وسطی ایشیا کے اکثر مسلم ممالک میں یہی کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔

۲۔ اور اگر بطور استثنیٰ بعض اسلامی جماعتیں عوام کو ساتھ ملا کر انتخابات جیت گئیں تو انہیں حکومت نہیں کرنے دی گئی جیسے ترکی میں ہوتا رہا، الجزائر اور فلسطین میں ہوا اور حال ہی میں مصر میں ہوا ہے۔

۳۔ اسلامی جماعتوں اور تحریکوں کی جدوجہد فرد اور معاشرے کی اسلامی تناظر میں اصلاح سے ہٹ کر غلبۂ اسلام بذریعہ سیاسی جدوجہد پر مرتکز ہوگئی جس سے دعوت و اصلاح کا کام نہ ہونے کے برابر رہ گیا اور مسلم معاشرے کے عامۃ الناس اور خواص اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔

۴۔ جمہوریت کے ساتھ مصالحت کے نتیجے میں ملحدانہ مغربی فکر و تہذیب کے ساتھ مصالحت خود بخود ہوگئی اور اسلامی عناصر کو یہ بات بھول گئی کہ مغرب کے غیر اسلامی افکار کو ردّ کیے بغیر وہ ان پر اسلامی اصولوں کی برتری کی بات کر ہی نہیں سکتے اور مغربی تہذیب کے لائف اسٹائل اور تہذیبی مظاہر کو ردّ کیے بغیر اسلامی اصول و اقدار کی برتری اور بالادستی کے ان کے موقف میں کوئی وزن پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ہمارے ان علماء و اسلامی سکالرز کی پچھلی نصف صدی کی دعوتی و علمی تحریروں اور تقریروں کا جائزہ لے لیجیے اس میں مغربی افکار اور تہذیبی مظاہر کا رد بہت کم ہے اور وہ اس موضوع کو بہت کم چھیڑتے ہیں۔

اور اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ خانۂ خالی را دیواں می گیرند کے مصداق مغربی استعمار جو اپنی فکر

وتہذیب کو مسلم معاشرے پر تھوپنے میں ہمیشہ سرگرم رہا ہے، اس نے گلوبلائیزیشن کے ایجنڈے کے تحت مسلم معاشروں پر فکری وتہذیبی یلغار کر دی اور مسلم تحریکوں کے کارکن دعوت واصلاح کے کام کو چھوڑ کر اور لادین جمہوریت کی سیاسی سرگرمیوں میں ہمہ وقت مصروف رہنے کی وجہ سے، نہ صرف خود اخلاقی اور دینی طور پر کمزور ہو گئے بلکہ ان میں سے بہت سے، بدقسمتی سے، مغربی فکر وتہذیب کے بالواسطہ علمبردار بن گئے اور اس کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں خصوصاً اپنے تعلیمی، تجارتی اور میڈیا کے اداروں کے ذریعے۔

خلاصہ یہ کہ مغربی جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے ’اسلامی جمہوریت‘ قرار دینے اور اسے غلبۂ اسلام اور اقامت دین کے لیے حصول اقتدار کا ذریعہ اور زینہ سمجھ لینے کا تجربہ عملاً ناکام ہو چکا ہے۔ اب نئے وژن اور نئے اجتہاد کی ضرورت ہے اور علماء اسلام اور اسلامی سکالرز کو اس حوالے سے نئے فیصلے، طوعاً یا کرہاً، جلد یا بدیر کرنے ہی پڑیں گے۔

سیاسی نظام کی بجائے غلبۂ دین کے طریق کار کی بحث

اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے اور عصر حاضر کی مسلم ریاست میں اس کے انطباق کی کیا صورت ہوگی؟ یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر غور وفکر ہونا چاہیے لیکن یہاں اِس وقت اسلام کے سیاسی نظام کے قیام کی بحث غیر متعلق ہے کیونکہ اس وقت پاکستان میں عملاً جو سیاسی صورتِ حال ہے اس میں اسلام کا آئیڈیل سیاسی نظام قائم کرنے کا علم بردار کوئی ہے ہی نہیں۔ بڑی سیاسی جماعتیں مغربی جمہوریت کے زیر اثر بڑی حد تک سیکولر ہو چکی ہیں۔ اس جمہوری نظام میں دینی سیاسی جماعتیں ناکام ہو چکی ہیں اور متعدد وجوہ کی بناء پر عامۃ الناس انہیں ووٹ نہیں دیتے (کیونکہ وہ فرقہ واریت پر مبنی ہیں، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتی رہتی ہیں اور نفاذ شریعت اور عوام کے مسائل حل کرنے کا کوئی متفقہ پروگرام ان کے پیشِ نظر نہیں، علاوہ ازیں ووٹ برادری اور قبیلے کو ڈالے جاتے ہیں، فروخت کر دیے جاتے ہیں، عوام میں دینی اور سیاسی شعور کم ہے......وغیرہ) اور اس پر مستزاد یہ کہ بین الاقوامی قوتیں اپنے مقامی گماشتوں کے ذریعے دینی قوتوں کے خلاف ایسا سیاسی ماحول تخلیق کرنے میں کامیاب رہتی ہیں جس میں وہ جیت نہ سکیں۔ ان حالات میں اِس امر کا کوئی امکان نہیں کہ مغربی جمہوریت کے پاکستانی ماڈل یعنی ’اسلامی جمہوریت‘ کے ذریعے دینی سیاسی جماعتیں کامیاب ہو کر اقتدار کو غلبۂ دین کی کے لیے استعمال کر سکیں۔ لہٰذا مغربی جمہوریت یا برائے نام ’اسلامی جمہوریت‘ کی بجائے اسلام کے معیاری سیاسی نظام کے قیام کی بحث یہاں غیر متعلق ہے۔

اسی طرح یہ سوچنا بھی بے کار ہے کہ موجودہ جمہوریت کے ہوتے ہوئے کوئی ایسے طریقے سوچے جائیں کہ یہاں دینی سیاسی جماعتیں کامیاب ہوجائیں کیونکہ ۶۶ سال کا تجربہ یہ ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوسکتیں کیونکہ ان میں اتنی اہلیت اور صلاحیت ہے ہی نہیں کہ وہ ان موانع کو دُور کرسکیں جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اور فرض کیجیے کہ وہ کسی طرح کامیاب ہوبھی جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ اسلام اور مسلم دشمن بین الاقوامی قوتیں انہیں اقتدار میں آ کر کام نہیں کرنے دیں گی جیسا کہ انہوں نے الجزائر میں کیا، افغانستان اور فلسطین میں کیا اور حال ہی میں مصر میں کیا ہے۔ ایم ایم اے کی حکومت سرحدی صوبے میں برسر اقتدار آئی لیکن کوئی نتائج نہ دے سکی اور ہم کہتے ہیں کہ اگر انہیں مرکز میں کلی اختیارات مل جائیں تو وہ پھر بھی کچھ نہیں ڈیلیور کرسکیں گی کیوں کہ انہوں نے اس کے لیے کوئی ہوم ورک نہیں کر رکھا، رجال کار نہیں تیار کیے اور کوئی تھنک ٹینک نہیں کام کر رہے۔ پھر موجودہ سیکولر ذہن کی عدلیہ، فوج، پولیس، وکلا، سکول، کالج اور یونیورسٹیاں اور میڈیا انہیں ریاستی رٹ کے زور پر اسلام کہاں نافذ کرنے دیں گے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بین الاقوامی قوتیں اور ان کے مقامی ایجنٹ اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک انہیں شریعت اسلامی کے احکام پر کیسے عمل کرنے دیں گے؟ لہٰذا ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ موجودہ طرز کی جمہوری جدوجہد کے ذریعے ایسی حکومت قائم نہیں کی جاسکتی جو فرد اور معاشرے کو اسلام پر چلنے میں مدد دے اور اسلامی تناظر میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرے۔

ایک بنیادی خرابی

ہم نے اس مضمون کے شروع میں عرض کیا تھا کہ غلبۂ دین کے تین محور ہیں: ۱۔فرد ۲۔معاشرہ، اور ۳۔ریاست۔ ہماری دینی سیاستی جماعتوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے دو محوروں پر بہت کم کام کیا اور تیسرے محور پر ساری کوششیں مرکوز کر دیں اور صرف سیاسی جدوجہد کے ذریعے اور (برائے نام) 'اسلامی جمہوریت' کے راستے سے اقتدار حاصل کر کے غلبۂ دین کی کوشش کی جس میں انہیں ناکامی ہوئی اور اسلامی آئین وقوانین بنوانے میں جو بظاہر جزوی کامیابی انہیں حاصل ہوئی اس سے بھی کوئی کارآمد نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ اسٹیبلشمنٹ اور سیاسی و انتظامی ڈھانچہ (بیوروکریسی، فوج، پولیس، عدلیہ وغیرہ) اس پر عمل درآمد کرنے کا خواہاں تھا ہی نہیں اور نہ آج ہے۔

متبادل طریق کار

مندرجہ بالا بحث سے دو باتیں واضح ہوگئیں: **ایک** یہ کہ پاکستان میں غلبۂ دین کے حوالے سے 'اسلامی جمہوریت' (جو اپنی سپرٹ میں آج بھی مغرب کی سرمایہ دارانہ اور ملحدانہ جمہوریت ہی ہے) کا

تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ غلبۂ دین کا انحصار ہمارے سیاسی نظام پر ہے ہی نہیں اور ’اقامت دین بذریعہ سیاسی جدوجہد‘ یا ’غلبۂ دین بذریعہ انقلاب امامت‘ کا نظریہ بھی ناکام ثابت ہو چکا ہے اور پاکستان میں ایسے حالات موجود ہی نہیں کہ یہاں اسلام کا آئیڈیل سیاسی نظام قائم ہو۔ لہٰذا اب پاکستان میں غلبۂ دین کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ وہ دینی عناصر جو پاکستان میں غلبۂ دین کے خواہاں ہیں (دینی سیاسی جماعتیں ہی نہیں، دینی مدارس اور تبلیغی و اصلاحی تحریکوں کے کارکن بھی اور سول سوسائٹی کے دین دار افراد بھی) وہ غلبۂ دین کے لیے تبدیلی اور اصلاح کے پہلے اور دوسرے محور پر کام کریں یعنی اصلاح فرد اور اصلاح معاشرہ کے کام پر توجہ مرکوز کریں۔ اصلاح فرد کے لیے وہ سارے ذرائع استعمال کیے جائیں جو تعمیر شخصیت کے لیے ضروری ہیں یعنی قرآن کے الفاظ میں: ۱۔ تعلیم کتاب (وسنت) و تعلیم حکمت (خصوصاً میڈیا) اور تزکیۂ نفس یعنی تربیت اور تعمیر سیرت و کردار۔ اور اصلاح معاشرہ کے لیے مساجد کو مراکز بنا کر ۱۔ افلاس کم کرنے، ۲۔ امن و امان بحال کرنے اور ۳۔ پسماندہ طبقوں (یتیموں، بیواؤں، مساکین) کی دست گیری کرنے (خدمت خلق) کا کام وسیع پیمانے پر کیا جائے اور ساتھ ہی تعلیم کتاب و حکمت و تزکیہ کا کام معاشرے میں وسیع پیمانے پر کیا جائے۔ غرض ان دونوں محوروں پر پوری توجہ مرکز کی جائے اور خوب محنت کی جائے یہاں تک کہ دین افراد کی زندگیوں میں آ جائے اور معاشرے کے اصول و اقدار، رسوم و رواج، عادات و تقالید اور مظاہر فکر و عمل پر غالب آ جائے۔ حکومتی اداروں (فوج، پولیس، عدلیہ، بیوروکریسی......) میں کام کرنے والے افراد کی زندگیوں میں بھی دین آ جائے - پورا دین، صرف نماز روزہ اور داڑھی و شلوار نہیں)۔

جب یہ ہو جائے گا تو سمجھیے کہ غلبۂ دین کا ۸۰ فی صد کام ہو گیا۔ اس کے اثرات ریاست و حکومت پر بھی لازماً پڑیں گے، ووٹروں پر بھی پڑیں گے، انتخابات پر بھی پڑیں گے۔ اُس وقت اگر فرد اور معاشرے کے مثبت اثرات ریاستی اقتدار پر نہیں پڑتے تو بھی آپ اس قابل ہوں گے کہ ’فک کل نظام‘ کے تحت مغربی تہذیب کے تحت قائم ابلیسی نظام اور ڈھانچے کو اٹھا کر بحر ہند میں پھینک دیں جیسے کہ ایران میں ہوا۔ اُس وقت دنیا کی کوئی طاقت آپ کا راستہ نہیں روک سکے گی اور ’جاء الحق و زھق الباطل، ان الباطل کان زھوقا‘ کا منظر آنکھوں کے سامنے ہوگا۔

اے اللہ! ہمیں وہ دن ضرور دکھانا، وما ذلک علی اللہ بعزیز

(بقیہ صفحہ ۳۱)

ان سطور کے قلم بند کرتے ہوئے راقم کے علم میں آیا کہ اسلام آباد میں سلطان بشیر محمود صاحب (سابق اٹامک انجینئر) فحاشی وعریانی کے خلاف لاکھوں لوگوں کے دستخط کرا کر ایک محضر نامہ سپریم کورٹ میں پیش کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہم اس کی بھرپور تائید کرتے ہیں اور دینی جماعتوں سے پھر کہتے ہیں کہ اس موضوع پر تحریک چلانے کا سوچیں کیونکہ یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے، کسی کو اس سے اختلاف نہیں، لوگ بے حیائی سے تنگ ہیں اور وہ بہ آسانی آپ کا ساتھ دیں گے۔

دینی مدارس کا نظام تعلیم　　　　مولانا عبدالقیوم حقانی

دینی مدارس اور اصلاحِ نصاب

البرہان کی خصوصی اشاعت 'نصاب مدنیؒ' پر ماہنامہ 'القاسم' کا تبصرہ

'دینی مدارس کا نصاب تعلیم' ایک عرصہ سے موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اور 'اہل علم' علوم کی بعض ایسی کتابوں کو نصاب سے خارج کرنے کے داعی رہے ہیں جو تاریخ کا حصہ ہو چکے ہیں اور فی زمانہ ان کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ یہ حضرات ان کتابوں کی بجائے عصری علوم کی کتابوں کو شاملِ نصاب کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ بھی انہی 'اہل علم' میں سے تھے جو دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح و ترتیبِ نو پر زور دیتے تھے اور آپ نے ایک نصاب بھی ترتیب دیا تھا جس پر ہماری معلومات کے مطابق بنگلہ دیش میں تو عمل ہو رہا ہے مگر ہندوستان اور پاکستان میں اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کوئی معمولی شخص نہ تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند جیسے بڑے اور عالمگیر شہرت کے حامل ادارے کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے اور اپنے وقت کے سب سے بڑے عالمِ شریعت اور شیخ طریقت تھے۔ اگر ان جیسی شخصیت بھی مدارس کے نصاب کی ترتیب نو کی ضرورت محسوس کرتی تھی تو تسلیم کر لیا جانا چاہیے تھا کہ واقعی کچھ علوم کی تدریس بے فائدہ ہو چکی ہے اور ان کی تعلیم، ضیاعِ اوقات کے سوا کچھ نہیں۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں دیوبندی مکتب فکر کے ننانوے فیصد مدارس حضرت مدنی کے نام اور نسبت پر چل رہے یا چلائے جا رہے ہیں۔

حضرت مدنی رحمہ اللہ کے اخلاص وخلوص کا اندازہ کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ انہوں نے اپنے

ہم عصر اہل علم کی کتابوں کو شامل نصاب فرمایا ہے مثلاً حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی ’تعلیم الاسلام‘ مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمہ اللہ کی علم الفقہ، قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی رحمت اللعالمین، منشی محمد دین فوق کی ’تاریخ الحدیث فی الاسلام‘ علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کی ’الفاروق‘ وسیرت النعمان اور اکبر شاہ خان نجیب آبادی کی ’تاریخ الاسلام‘ حتیٰ کہ مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال اور مرزا غالب کے کلام کو بھی شامل فرمایا ہے۔

مدنی نصاب تعلیم پر مدیر ’البرہان‘ کا تجزیہ وتوضیح خاص طور سے لائق مطالعہ ہے۔ جس کا حرف آخر یوں بیان کیا گیا:

> ’ہم پاکستان کے تمام اہل مدارس سے عموماً اور حنفی دیوبندی مکتبِ فکر سے خصوصاً درخواست کرتے ہیں کہ وہ مولانا سید حسین احمد مدنی ؒ کے تیار کردہ اس نصاب پر بار بار غور فرمائیں۔ اس کی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور مولانا کی فکر کے مطابق اپنے نظام تعلیم اور اپنے دینی مدارس کی اصلاح کریں تاکہ امت کو وہ متوازن شخصیت میسر آسکے جو اسلام کو مطلوب ہے اور جس کی نشاندہی کھل کر مولانا مدنی ؒ نے اس نصاب میں کی ہے‘۔

ہم مدیر ’البرہان‘ کی اس اپیل کی مکمل تائید وحمایت کرتے ہوئے یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؎

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے   تاحیات 5000 روپے

دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ وطالبات کے لیے   250 روپے سالانہ

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ B-369، فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

اور درویش کی صدا کیا ہے

اور وفاق المدارس کے ارباب حل وعقد بالخصوص نصاب کمیٹی کے ارکان کو برہان کی اس خصوصی اشاعت کا مخلصانہ مطالعہ کرنا چاہیے اور حتیٰ الامکان نافع امور کو لے لینا چاہیے۔

ضخامت ۵۸ صفحات، پتہ: ۱۳۶ نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور رابطہ نمبر: ۰۳۰۰-۴۳۵۴۶۷۳

میڈیا		مدیر

بچوں پر جنسی تشدد

میڈیا پر بچوں پر جنسی تشدد کے گھناؤنے واقعات تواتر سے سامنے آرہے ہیں اور والدین پریشان ہیں کہ اپنے پھول سے بچوں کو کہاں لے جائیں۔

اس اخلاقی اور معاشرتی المیے کی مذمت بجا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کے اسباب کیا ہیں؟ اگرچہ انٹرنیٹ اور موبائل کے غلط استعمال، مخلوط تعلیم، دین سے دوری، جہالت وافلاس، ناقص قانونی اور کرپٹ عدالتی نظام اور اخلاقی ومعاشرتی بگاڑ کا بھی اس میں حصہ ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کی بنیادی

ذمہ داری ہمارے الیکٹرانک میڈیا پر ہے جو فحاشی اور عریانی کو پروموٹ کر رہا ہے۔ ہر گھر میں ٹی وی موجود ہے اور آپ کوئی چینل کسی وقت کھول کر دیکھیے ناچ گانے اور عریانی وفحاشی سے آپ بچ نہیں سکتے، خواہ آپ خبریں سن رہے ہوں یا آپ کے بچے کارٹون دیکھ رہے ہوں۔ نوجوانوں کے جذبات اس طرح بھڑکا کر اہل میڈیا خود انہیں بے راہ روی اور جذباتیت کی راہ پر ڈال رہے ہیں، پھر جب کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے تو اسے بھی نمک مرچ لگا کر بار بار پیش کیا جاتا ہے اور یوں فحاشی کے پھیلانے کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔

ہے کوئی میڈیا کی اس روش پر اسے ٹوکنے والا؟ حکومت کہاں سوئی ہوئی ہے؟ میاں نواز شریف صاحب تو وضع دار اور مشرقی اقدار کے حامی گردانے جاتے ہیں وہ قوم کو اس فحاشی وعریانی سے نجات دلانے کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ پیمرا کہاں سویا ہوا ہے؟ صحافتی تنظیمیں کیوں خاموش ہیں؟ علماء کرام، دینی جماعتیں اور سول سوسائٹی کے دین دار لوگ کیوں اس میڈیا کے خلاف حرکت میں نہیں آتے؟ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ پیمرا کا سربراہ کسی ایسے آدمی کو لگایا جائے جو اسلامی اقدار کی حفاظت کرنے کا عزم رکھتا ہو اور یہود وہنود کی فحاشی وعریانی پر مبنی پالیسیوں اور پروگراموں کو بند کرانے کی جرأت رکھتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا الیکٹرانک میڈیا ایک ناسور بن چکا ہے۔ اس کے خلاف تحقیقات کی جائیں کہ ان میں سے کون کون غیر ملکی ایجنسیوں اور حکومتوں کے ہاتھوں بکا ہوا ہے، اسلام اور نظریۂ پاکستان کا خون کر رہا ہے اور ہماری اخلاقی اور معاشرتی اقدار کو تباہ کر رہا ہے؟

ہم نے تنظیم اسلامی اور دوسری دینی جماعتوں کو توجہ دلائی تھی کہ اس موضوع کو لے کر اٹھیں اور تحریک چلائیں۔ تحریک چلانا تو درکنار علماء کرام اور دینی جماعتوں کو اس کی مذمت کرنے کی بھی فرصت نہیں۔ اے اللہ! ہمارے حال پہ رحم فرما۔ **(باقی صفحہ ۲۸ پر)**

فکرِ مغرب　　　　ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

ہیومنزم کیا ہے؟

ہیومنزم یا انسانیت پرستی کی فکر اور اس کے ماتحت علوم انسانی (معاشرتی ومعاشی علوم) کا تانا بانا یونانی فکر سے نکلتا ہے جیسا کہ پانچویں صدی قبل مسیح کا یونانی مفکر ’’پروتاغور‘‘ کہتا ہے کہ:

’’انسان کائنات کی تمام اشیاء کا پیمانہ ہے۔‘‘

یعنی اس کائنات میں مقصود بالذات ہستی انسان ہے اور انسان اس کائنات کی ہر شئے کو اپنی مرضی (Decision) اور منشاء (Will) کے تابع کرنا چاہتا ہے۔ انسانیت پرستوں کے نزدیک دراصل اس

کی اشتہاء اور خواہش ہی اس کا مقصود ہے اور جو کچھ اس کی خواہش ومنشاء کے مطابق ہے وہ سب خیر ہے۔مغربی نظریۂ انسان پرستی زندگی کے ہر موڑ پر وجود لغیرہ (Being other than itself) کے واہمہ میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی لیے وہ ہر لحہ مظاہر اشیاء کی فسوں کاری کا شکار رہتا ہے۔ دراصل انسانیت پرستی مغرب کی کاروباری ذہنیت کی آئینہ دار ہے جس کی نمونوآبادیاتی فکر سے ہوئی اور اس کی جڑ بنیادان نوآبادیاتی علاقوں سے چھینی گئی دولت پر رکھی گئی۔اس مال مفت نے مغربی انسان کی اشتہاء پر جلتی تیل کا کام کیا اور اس کو روایتی معاشرہ وتہذیب (عیسائیت) کے خلاف معاشرتی، معاشی اور سیاسی طور پر بغاوت پر اکسایا اور انسانی زندگی میں انقلاب عظیم برپا کر کے اس کو سرتاپا لذات پرست،قوم پرست، سرمایہ دار،لبرل اور سیکولر بنادیا۔

چودھویں صدی سے انسانیت پرستی کو عروج حاصل ہوا اور خدا پرستی کی جگہ انسانیت پرستی نے لی اور اس فکر نے خدا اور کتاب (بائبل) سے رشتہ کاٹ کر نئے سرے سے رومی اور یونانی ادبیات وفلسفہ سے مغرب کا رشتہ جوڑا۔ یہ تحریک دراصل مذہب اور عیسائیت سے بغاوت کی تحریک تھی۔ مذہب وعیسائیت کو ترک کر کے رومی اور یونانی فلسفہ وفکر کی روشنی میں نئے اصول وضع کیے گئے اور ان کی روشنی میں سائنس ،کاروبار اور صنعت (Trade & Industry) کو ان علوم کی روشنی میں انسانی ضروریات،خواہشات واشتہاء سے ہم آہنگ کر دیا گیا۔اس ضمن میں ہائڈیگر، ولیم جیمز، جان دیوی اور شلر کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔انسان پرستی کو بطور اصطلاح پہلی بار''شلر''ہی نے استعمال کیا تھا۔انسانیت پرستی میں خاص طور پر اس دنیا پر زور دیا جاتا ہے جو براہ راست انسانی تجربہ اور مشاہدے میں آچکی ہے۔

انسانیت پرستی کی اصل اور خصوصی اقدار تحریک نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے عہد سے وابستہ ہیں۔ان کی یہ اصلیت اور خصوصیت کسی اور عہد اور مقام (Time & Space) کے لیے موزوں نہیں۔نشاۃ ثانیہ کے فلسفۂ انسان پرستی کا تعلق یونانی اور رومی فکر سے ہے جو بلاشبہ عقلی (Rational) اور غایاتی (Telos) تھی۔ یہ لوگ عقلی وجدان پر بھروسہ کرتے تھے جبکہ موجودہ انسانیت پرستی کی فکر کلیتاً حواس وادراک پر مبنی ہے اور یہ صَرف (Consumption) ،لذت پرستی، افادہ پرستی، انفرادیت پسندی کی دلدادہ ہے۔ یونانی ورومی فکر کے برخلاف انسانیت پرست عقل ووجدان کو حواس وادراک کا مماثل خیال کرتے ہیں۔رومی اور یونانی فکر کے اصول ایک خاص روحانی (Moral) اصول پر قائم اور مقرر تھے لیکن موجودہ انسانیت پرستی کے فکری اصول مفروضات (Axioms) اور قیاسات (Propositions) پر قائم ہیں۔دراصل یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن پر مغربی طرز فکر کی اساس رکھی گئی ہے۔

رومی اور یونانی فکر میں قدرت یا فطرت کو ایک مقصد سمجھا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں میکانیت

ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ گو کہ مغرب کی انسانیت پرست تہذیب اپنا تعلق ماضی میں رومی اور یونانی تہذیب سے وابستہ کرتی ہے اور اس تحریک کو عالمگیر بنانے کی پیہم کوششوں میں مصروف ہے لیکن رومی اور یونانی تہذیب نے اپنے مقام سے نکل کر کبھی بھی اپنے نظریات واقدار کو عالمگیر بنانے کی سرمایہ کے زیر سایہ کوشش نہیں کی۔ انسانیت پرست اقدار کو عالمگیریت عطا کرنے کی یہ کوشش صرف نشاۃ ثانیہ کے عہد سے ہو کر سرمایہ داری کے عہد کی ایک کہانی ہے جو بادشاہت سے جمہوریت تک، دربار سے منڈی تک شیطان پرستی سے نفس پرستی تک، زر پرستی سے سرمایہ پرستی اور نوع وقوم پرستی (Nationalism) سے خود پسندی اور مادر پدر آزادی (Freedom) تک پھیلی ہوئی ہے۔

ہیومنزم کی ایک اجمالی تفہیم

اگر انسان پرستی کی تعریف انسانیت پرستی کے لٹریچر کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانیت پرستی کا مفہوم دنیوی بمقابلہ دینی، روحانی بمقابلہ اخلاقی، کشفی بمقابلہ عقلی، علمی بمقابلہ عملی کے ذریعے طے پاتا ہے۔ انسانیت پرستی کا مفہوم آزادی اور انتخاب کے ساتھ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان ہی دونوں صلاحیتوں کی بنا پر وہ اپنی الوہیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی آزادی اور انتخاب کی صلاحیت انسان کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر کے اس کو خدا بیزاری پر ابھارتی ہے۔ تاریخی طور پر انسانیت پرستی کا مسلک اس جدوجہد کا غماز ہے کہ انسان خود اپنی الوہیت کا دعویدار ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آپ کو ایک مقصود کل کی شکل میں پیش کرنا چاہیے تاکہ انسان اپنے دعویٰ میں حقیقت کا روپ بھر سکے اور یہ خیال کیا جانے لگے کہ اس کی ہر حرکت نیکی وفلاح کا نتیجہ ہے اور وہ جو بھی اعمال انجام دیتا ہے وہ فلاح ہی فلاح ہے اور اس کی یہ تمام خوبیاں باہم مربوط ہیں اور اس کی الوہیت حق کے نصب العین کی مختلف کڑیاں ہیں۔ وہ چاہے تو روشنی میں سایہ اور سایہ میں روشنی پیدا کرے کہ وہ ایک عظیم ہستی ہے اور اس کا ہر عمل مسرت (Pleasure) کے حصول کا پیش خیمہ ہے۔

انسانیت کا فلسفہ اقدار کے بجائے ضروریات (Needs) پر زور دیتا ہے نیز محبت (Love) کی بجائے مسابقت (Competition) کو اہم قرار دیتا ہے تاکہ انسان اپنی تمام تر باطل جبلتوں کو بروئے کار لا کر الوہیت کا حق دار بن جائے اور "**لا الٰہ الا الانسان**" کہنے کا مکلف بن جائے۔ وہ اپنی اسی روش اور صلاحیتوں کی بنا پر اپنے نفسی نظریات واستحقاق کو قائم بالذات حیثیت دے کر رد یا پسند کرنے کا اختیار رکھتا ہے یعنی وہ جو چاہے سو چاہے۔ انسانیت پرستوں کے نزدیک انسان ہی وہ ہستی ہے جو اپنے حصول مقصد کے لیے الوہیت وابدیت کی طرف گامزن ہے۔ اس حصول مقصد کے تحت وہ ایک ایسے

مقام پر کھڑا ہے جہاں سے وہ اپنی اس ابدیت والوہیت کے اختیار کی بنا پر دائرے کے تمام حصوں اور تمام افقوں پر یکساں نظر رکھ سکتا ہے۔ یہ تمام دائرے اور افق صرف اس کے حال سے وابستہ ہوتے ہیں اسی لیے ہر انسانیت پرست ابن الوقت ہوتا ہے۔ اس کی ہر کوشش حال کو مزین کرنے پر صرف ہوتی ہے، اسی لیے اس کا نصب العین ہم عصر زندگی سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ آنے والے حال یعنی جنت اور زندگی بعد موت کا کوئی ادراک کر ہی نہیں سکتا۔ وہ تو صرف عمرانی علوم کے ذریعہ دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے اور اسے اپنے حسب منشاء وحسب حال بنانا چاہتا ہے۔ دنیا اور اس کے لوازمات کو اپنی خواہشات اور مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت وہ تسخیر کائنات کرنا چاہتا ہے۔ اسی جذبے کو ہوا دے کر انسان کو مافوق الفطری انسان یعنی Superman بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے انسانیت پرستی مذہب اور خدا کے خلاف احتجاج کا نام ہے۔ یہ ان خیالات کا پرتو ہے جن کو موجودہ زمانے (یعنی Modern World) میں کافی اہمیت حاصل ہے۔ Modernisation اور صنعتی انقلاب حضرت انسان کو اتھاہ تاریکی اور انتہائی کرب میں مبتلا کر چکی ہے۔ اس صنعتی انقلاب نے فکر اخروی کی جگہ دولت اور مادی اشیاء کے حصول کی خواہش کو برانگیختہ کیا۔ انسانیت پرستی کے ساتھ اشتراکیت کے تال میل نے دہریت اور مادہ پرستی کو مزید ترقی دی۔ صنعتی انقلاب کے زیر سایہ مالیاتی انقلاب نے ایک امربیل کے طور پر آفرینش حاصل کی اور اس مالیاتی انقلاب نے بینک، مالیاتی اداروں، ملٹی نیشنلز کی شکل میں الوہیت نفس کی خواہش کو ووٹ اور نوٹ (زر) کی شکل میں مجسم کیا، جس کے تحت انسان اور ارتکاز سرمایہ (Capital Accumulation) کو الوہیت کے حصول اور ازلی زندگی کی خواہش کے نتیجہ کا پیش خیمہ سمجھنے لگا۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر عہد حاضر کا تمام زور تخیل وفکر خواہ انسانیت پرستی کی کسی بھی شکل (حقوق انسانی، حقوق طفلاں، گرین پیس، ماحولیات وغیرہ)، میں ہو وہ سب کا سب ارتکاز سرمایہ کے عمل پر مرکوز ہے۔ دراصل ارتکاز سرمایہ کی خباثت کو چھپانے کے لیے ہی ہیومن رائٹ کے مختلف طریقے، پیرائے اور اسالیب وضع کیے گئے ہیں۔

انسانیت پرستی اور ابدیت کی امید (Hummanism & Eternality)

انسانیت پرست کہتے ہیں کہ ابدیت کی خواہش کا مسئلہ اصل انسانی مسئلہ ہے۔ ابدیت کی اس خواہش کو وہ اپنی مابعد الطبیعیات (Metaphysics) یا الٰہیات کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس خواہش کی تکمیل کے لیے انسان نے اب تک غیر معمولی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ ابدیت (Eternality) کی اس طرح کی خواہش کا اظہار انسانی تاریخ کے مصدقہ ریکارڈ میں کہیں نہیں ملتا۔ ابدیت کی یہ خواہش خاصہ ہے موجودہ جدید دور کے انسان کی خواہش الوہیت کا، جو صرف مغرب کے باطل مادی

فکر کا کارنامہ ہے۔آج کا مغربی انسان ابدیت کی زبردست خواہش رکھتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ اس حیاتیاتی (Biological) حادثہ سے ماورا ہے جسے موت کہا جاتا ہے۔لیکن انسان مسلسل ایسی سرگرمیوں کا متلاشی ہے جو اس کی حیاتیاتی زندگی کو طویل سے طول تر کر سکے اس لیے کہ میں لافانیت کے حصول کے لیے جو بھی کام کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کے لیے وقت درکار ہے۔وہ وقت نہیں جواب تک ختم ہو چکا ہے بلکہ وہ وقت جو آنے والا ہے۔چنانچہ میں اس عبوری وقفہ میں اپنی صلاحیتوں کو لافانیت کے حصول کے لیے صرف کرتا ہوں۔کسی کام یا کسی شوق کو انجام دینے کے لیے جن صلاحیتوں،قابلیتوں اور قوتوں کی ضرورت ہے انہیں برقرار رکھنا ہی زندگی ہے۔ان صلاحیتوں،قابلیتوں اور قوتوں کا صحیح اظہار ارتکاز سرمایہ میں پنہاں ہے۔ارتکاز سرمایہ ہی وہ شکتی یا مخفی قوت ہے جو مجھے اور میری صلاحیتوں کو لافانیت عطا کرتی ہے۔یہی ارادہ کی آزادی ہے۔یہی وہ کام ہے جو اس لمحے سے ماورا ہے جسے موت کہتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے جینا مرنے سے انکار کرنا ہے۔ارتکاز سرمایہ اور بچت (Saving) ہی میری کل آنے والی دلچسپیوں کی امید برقرار رکھتی ہے اور اس سلسلہ لامتناہی کو برقرار رکھتی ہے جس کو زندگی کہتے ہیں۔یہی جینے کا مقصد اور جینے کی آرزو ہے جو تمام جزوی خواہشوں کی بدیہی حقیقت ہے۔جس نے ہر خواہش کو اِرتکاز سرمایہ کی خواہش میں مجتمع کر دیا ہے۔انسانیت پرستوں کے نزدیک موت ایک عالمگیر دشمن ہے،اس لیے اس خوفناک تصور کے خلاف صف آراء ہونا انسان کو یہ امید دلاتا ہے کہ وہ ایک دن موت پر غالب آجائے گا اور اپنی الوہیت کے مقصد کو تسخیر کائنات کی شکل میں مافوق الفطری انسان بن کر حاصل کر لے گا۔انسانیت پرستوں کے نزدیک لافانیت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا کھاتہ کبھی بند نہیں ہوتا،دیوالیہ پن کی نوبت کبھی نہیں آتی اور کوئی ناقابل تلافی نقصان نہیں ہوتا۔لافانیت کی خواہش انسان کو مستقبل کی دنیا میں لے جاتی ہے۔جہاں حال سے زیادہ کامیابی ومسرت ذاتی کا حصول ممکن ہے۔اس لیے ہر انسان کو اپنی موجودہ زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔یہ کوشش اس وقت مسرت ولافانیت سے سرشار ہوگی جب اس کے پاس زیادہ سے زیادہ سرمایہ ہوگا۔

دوسری طرف حیات بعد الموت کی دنیا مذہبی تخیل کی دنیا ہے ایک ایسی فرضی دنیا جس تک رسائی اس دنیا میں ممکن نہیں۔

نعوذباللہ من ھذا الاعتقاد الفاسد:

''اللہ ہمیں اس اعتقاد فاسد سے محفوظ رکھے۔''

مغربی تہذیب اور مغربی فکر سے مراد وہ طرز زندگی اور وہ نظام ہے جو قدیم یونان سے شروع ہو کر موجودہ جدیدیت (ماڈرن ازم) اور پس جدیدیت (پوسٹ ماڈرن ازم) میں آکر اپنے انجام کو پہنچا

ہے۔مغربی فکر کی اساس ''عقل'' کی برتری پر رکھی گئی ہے عقل ہی سب کچھ ہے اور یہی الہ بن چکی ہے۔ مغرب اس کی پرستش میں مصروف ہے۔ لہٰذا صداقت صرف وہی ہے جسے ہم خواس خمسہ سے معلوم کرسکیں۔خدا اور روح کے تصورات کو اسی لیے مغربی علوم سے خارج کردیا گیا کہ وہ حقیقت ہی نہیں جو حواس کی گرفت میں نہ آسکے، جسے عقل محسوس نہ کرسکے اور جو ماورائے عقل ہو۔لہٰذا مغرب میں ''حق'' (Right) اور انسان (Human) کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے اور خیر صرف اس آرزو تمنا اور خواہش کا نام ہے جو کسی انسان کے دل میں مچلتی ہے اور اپنے لیے عمل کا پیرہن تلاش کرتی ہے۔خواہش نفس الہ ہے (جسے قرآن نے شرک سے تعبیر کیا ہے) مغرب کسی مذہب، کسی خدا، کسی اخلاقی قدر، کسی فقہ، کسی شریعت، کسی وحی اور کسی قانون کو نہیں مانتا، وہ انسان کے رب ہونے کا مدعی ہے اور نفس انسانی کو وحی الٰہی بلکہ ''الہ واحد'' تسلیم کرتا ہے اور خواہش نفس کی غلامی کو مقصد زندگی مانتا ہے۔مغرب کا خیر وشر کا معیار صرف اور صرف نفسانی خواہشات کا حصول ہے۔اس کے علم کی بنیاد ایمان پر نہیں شک (Doubt) پر رکھی گئی ہے اور علم کا واحد مقصد تسخیر کائنات رہ گیا ہے۔اس تہذیب کا بنیادی المیہ یہ ہے کہ فرد کی پرستش کے باوجود یہ تہذیب فرد کی داخلی کیفیات کا کوئی ادراک نہیں رکھتی۔ یہ تہذیب عرفان ذات سے قاصر تہذیب ہے۔اس کی دنیا اور اس کا قلب دونوں بے نور ہیں۔دل کی دنیا کو تاریک کرنے والی یہ تہذیب خدا کی موت کی قائل ہے لہٰذا وہ کسی اخلاقیات کو ماننے پر تیار نہیں۔اس تہذیب کی نظر میں فرد کی زندگی کے چار مقاصد ہیں: (۱) دولت (۲) آمدنی (۳) قوت (۴) اختیار۔یہی اقدار مطلق ہیں اور ان میں اضافے کی جدوجہد ہی حاصل زندگی ہے۔اس تہذیب کا نعرہ ''مذہبی آزادی بنیادی ہے'' ایک دل فریب نعرہ ہے۔ لبرل ازم کا سب سے نمایاں فلسفی Jhon Paivls اپنی کتاب *Political Librerelism* میں لکھتا ہے کہ ''مذہبی آزادی کو لبرل ازم کے لیے خطرہ بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، وہ مذہبی نظریات جو لبرل آزادیوں کا انکار کردیں ان کو عملاً کچل دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا امراض کو ختم کرنا ناگزیر ہے۔''

فکر مغرب بندے کو رب مانتی ہے، وہ الوہیت انسانی کی قائل ہے جبکہ اسلام عبدیت اور عبادت کا قائل ہے، عبدیت قرب کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ خاتم المعصومین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بندے ہونے پر فخر فرمایا اور اسے انسانیت کی معراج قرار دیا ہے۔مگر مغرب عبد کے بجائے انسان کو رب تسلیم کرتا ہے۔اسلام میں یہ اللہ کا بندہ ہے، وہاں نفس کا بندہ، بلکہ اپنی ذات میں خود خدا ہے۔اس فلسفے سے انسانی حقوق اور بنیادی حقوق کے فلسفے اٹھے اور فرائض پس پشت چلے گئے، انسان اور حقوق ہی زندگی کا اصل مقصد بن گئے۔مغرب کے ورلڈ ویو (World View) کا محور ومرکز انسان ہے جبکہ

اسلام کا مرکز و محور خدا ہے۔ اسلام خدا پرستی کا قائل ہے جبکہ مغرب انسان پرستی کا علمبردار ہے۔

آل پاکستان دینی مدارس

مقابلۂ مضمون نویسی

پاکستان بھر کے دینی مدارس کے طلبہ کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مضمون نویسی کے ایک مقابلے میں حصہ لیں جس کا موضوع ہے **’’مذہبی فرقہ واریت: اسباب، نقصانات اور اصلاحی تجاویز‘‘**۔ مضمون کا حجم ۳۰۰۰ الفاظ کے قریب ہو۔ مسودہ کمپوز شدہ ہونا چاہیے۔ سافٹ کاپی بھی ای میل کی جاسکتی ہے۔ مضمون وصولی کی آخری تاریخ ۵ دسمبر ۲۰۱۳ء/ ربیع الاوّل ۱۴۳۵ھ ہے۔ کامیاب طلبہ کو مندرجہ ذیل انعامات دیئے جائیں گے:

اول انعام: ۱۰ ہزار روپے　　**دوم انعام: ۶ ہزار روپے**

سوم انعام: ۴ ہزار روپے　　**حوصلہ افزائی: سات انعامات**

ادارے کی کمیٹی کا فیصلہ حتمی ہوگا۔ مضامین مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کیے جائیں:

تحریکِ اصلاح تعلیم (ٹرسٹ) ۱۳۶ نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور ۵۴۰۰۷

ای میل ermpak@hotmail.com

فکرِ مغرب　　　　فصیح احمد ☆

تارِ عنکبوت

فکر مغرب کی حمایت میں مولانا وحید الدین خاں کے دلائل کا جائزہ

البرہان کے جون ۲۰۱۳ء کے شمارے میں مولانا وحید الدین خان کا فکرِ مغرب پر مضمون شائع ہوا

جس میں مولانا موصوف نے فکر مغرب اور فکر اسلامی میں تطبیق قائم کرنے کے ساتھ ساتھ فکر مغرب کو فکر اسلامی ہی کا عکس، نقش اور چربہ قرار دیا۔ مولانا کے نزدیک فکر مغرب درحقیقت فکر اسلامی ہی کی ایک شاخ [off shoot] ہے اور عہد جدید میں فکر اسلامی کی تشکیل میں انتہائی معاون ہے۔

راقم الحروف طویل عرصے سے مولانا کی مغرب، سائنس، مغربی علوم عقلیہ وٹکنالوجی سے متعلق دل نشین مگر حقیقت وعلمیت کے لحاظ سے کمزور اور مستند حوالوں کے بغیر تحریریں دلچسپی اور حیرت سے پڑھ رہا ہے۔ بسا اوقات مولانا مغربی فکر و فلسفے کے بارے میں ایسی کمزور باتیں لکھ دیتے ہیں جن کا مغرب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ فلسفے کا معمولی طالب علم بھی ایسی تحریریں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں مولانا کا اصل میدان دعوت وتذکیر ہے لیکن جب وہ اپنے اصل میدان سے ہٹ کر دیگر موضوعات خصوصاً مغرب، سائنس، ٹیکنالوجی اور عصر حاضر جیسے حساس موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تحریر میں مفروضوں اور غلط فہمیوں کی بھرمار نظر آتی ہے۔ مغرب سے متعلق مولانا کی تمام تحریروں میں ہمیں مغرب کے کسی صف اوّل کے فلسفی یا جدیدیت اور پس جدیدیت کے مفکرین کے حوالے نہیں ملتے بلکہ صرف انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل کی کتب کے چند حوالے ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ رسل کا شمار دوسرے درجے کے جدید فلسفیوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ونگسٹائن مشہور جرمن فلسفی نے کیمبرج میں پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ جمع کرایا تو ایک سو Propositions ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کر جمع کرادیے۔ رسل اور مور [Moor] اس مقالے کے ممتحن تھے انہیں یہ پرزہ دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ زبانی امتحان ہوا اور کئی گھنٹے ہوا۔ دونوں فلسفی اس مقالے کو سمجھ نہیں سکے مگر کہا کہ تم نے کچھ نہ کچھ تو لکھا ہے لہٰذا تمہیں سند دی جاتی ہے۔ اس موقع پر طالب علم کا جواب یادگاری تھا اس نے کہا 'Don't worry! philosophy is not the domain of English people'.۔ واضح رہے کہ تمام بڑے فلسفی یا تو جرمن ہیں یا فرانسیسی ۔

☆ جامعہ ہمدرد، کراچی

برٹرینڈ رسل جن کے مولانا بہت مداح ہیں اپنی کتاب *History of Westren Philosophy* میں ثابت کیا ہے کہ فکر مغرب اصلاً مذہب دشمن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا نے رسل کا مطالعہ بھی سرسری طور پر کیا ہے ورنہ مولانا کبھی یہ غلط رائے قائم نہ کرتے کہ اسلام اور مغربی فکر و فلسفہ اور جدید سائنس ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ افسوس کہ مولانا نے اپنی تحریروں میں

کبھی ماڈرن ازم یا پوسٹ ماڈرن ازم کے کسی ایک بڑے فلسفی کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ وہ ڈیکارٹ، لاک، کانٹ اور عہد حاضر کے بڑے فلاسفہ فوکالٹ، ہائیڈیگر، گلز ڈیلوز، رچرڈ رارٹی اور ہیبر ماس سے ناواقف ہیں۔ ان فلاسفہ کے حوالوں کے بغیر مغرب کے بارے میں ان کی کوئی تحریر لفاظی اور علمی تجاوز کے سوا کچھ نہیں۔

مولانا کے زیر بحث مضمون کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فکر مغرب کے حوالے سے مولانا کی علمی تحقیق کی سطح ایک عام شخص سے مختلف نہیں اور بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں ان کی معلومات کافی حد تک ناقص ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اخباری تراشوں، صحافیانہ مضامین اور مغرب میں شائع ہونے والی مشہور عام کتابوں [Popular books] اور انٹرنیٹ، فیس بک اور ہندوستان ٹائمز جیسے غیر علمی مآخذ پر اپنے علم کی بنیاد رکھتے ہیں لہٰذا مغرب سے متعلق ان کے تمام دعوے، بیانات اور تحقیقات پڑھ کر فلسفے، فلسفۂ سائنس، سائنس وٹیکنالوجی، ٹیکنو سائنس اور سائنٹزم کی اصطلاحات سے واقف کوئی بھی اہل نظر مولانا کی ناواقفیت کو محسوس کرسکتا ہے۔ حیرت ہے کہ سالہا سال سے دنیا بھر کے اسلامی حلقوں میں ان کی تحریروں کو نہایت غور سے پڑھا جارہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اسلامی علمی حلقوں کی بھی فلسفہ، فلسفہ سائنس اور جدید مغرب سے واقفیت بہت کم ہے ورنہ مولانا وحید الدین خاں کا زوردار نقد لکھا جاسکتا تھا۔

مولانا وحیدالدین خان صاحب سائنس اور ٹکنالوجی کے بارے میں اگر ہمارے مربی ومہربان جناب خالد جامعی صاحب (ناظم شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ جامعہ کراچی) کے شاگرد رشید جناب ظفر اقبال صاحب [جو ایک دینی مدرسے کے طالب علم ہیں] کی کتاب ''اسلام اور جدید سائنس۔ نئے تناظر میں [جناب ذاکر نائیک کے خطبات اور مناظروں کی روشنی میں]'' کا مطالعہ فرمالیتے تو انھیں اس موضوع پر عہد حاضر کے تمام بڑے فلسفیوں اور سائنس دانوں کے خیالات اصل مصادر سے پڑھنے کا موقع ملتا اور ان کے بہت سے واہمے دور ہوجاتے۔ اس کتاب میں مغرب کے تمام اہم فلاسفہ ہزرل، ڈیکارٹ، ہیوم، کانٹ، لاک، ہائیڈیگر، ہیگل، مارکس، اینجلز، فوکالٹ، رچرڈ رارٹی، ہیبر ماس سے لے کر مختلف جدید سائنسی مکاتب فکر کے علمائے کبار تھامس کوہن، کارل پاپر، فیرار بینڈ، ایمرلے کاٹوش، کے ساتھ ساتھ بڑے سائنس دانوں ٹالمی، نیوٹن، گلیلیو، کاپرنیکس، پلانکس، ٹائیکو براہی، کیپلر، آئن اسٹائن، فائن مین اور بے شمار فلسفیوں، سائنس دانوں، محققین، مفکرین کے حوالے درج ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا حوالہ بھی مولانا وحیدالدین خان کی کسی کتاب یا الرسالہ کے کسی پرچے میں نہیں ملتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دینی مدرسے میں پڑھنے والے ایک طالب علم کا مطالعہ مشاہدہ اور تجزیہ مولانا وحیدالدین خان

جیسے عالمی مفکر سے بہتر ہے۔ مولانا وحید الدین انہی دینی مدرسوں اوران کے علمائے کرام کے خلاف مسلسل خامہ فرسائی کررہے ہیں اورمغرب کی تاریخ، تہذیب، فلسفے کی مستقل مدح سرائی میں مصروف ہیں۔

ہم اپنے اس مضمون میں انتہائی اختصار کے ساتھ مولانا کے فکر مغرب کے حوالے سے قائم کردہ مفروضوں کا محاکمہ کریں گے تاہم ایک بات ہم مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب کی خدمت میں بصد احترام عرض کرنا چاہتے ہیں کہ البرہان ایک نظریاتی، تحقیقی وعلمی رسالہ ہے لہٰذا اس رسالے میں مضامین کا چناؤ اور مضامین کی اشاعت کے حوالے سے بھی علمی تحقیقی رویہ اپنانا چاہیے اورکوشش کرنی چاہیے کہ قارئین کو علمی وفکری انتشار سے بچایا جائے۔ انتشار ذہنی سے بچانے کے لیے اس بات کی کوشش کی جائے کہ ایسے گمراہ کن اورغیر علمی مضمون کو رسالے میں چھاپنے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر کسی مصلحت کے تحت کبھی شائع کرنا ضروری ہوتو پہلے کسی اہل علم کو وہ مضمون بھجوادیا جائے اوران سے جواب لکھوایا جائے۔ مضمون کا جواب ملنے کے بعد اس مضمون کے ساتھ اس جواب کو بھی شائع کردیا جائے۔ تاکہ قارئین دونوں کے موقف کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرسکیں کیونکہ بسااوقات قاری ایک ماہ کا رسالہ پڑھنے کے بعد دوسرے ماہ اس کا جواب کسی وجہ سے نہ پڑھ سکا تو اس قاری کے فکری انتشار یا گمراہی کا ذمہ دار کون ہوگا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ قارئین البرہان کو علمی وفکری انتشار سے بچانے کا اس سے بہتر اورمناسب کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ رائے ہے کہ البرہان کو ہائیڈ پارک نہیں بننا چاہیے۔ دینی علمی رسالوں کو ہائیڈ پارک میں تبدیل کرنے کا کام مولانا زاہد الراشدی صاحب نے الشریعہ کے ذریعے بخوبی انجام دیا ہے۔ دنیا بھر کی غلط سلط تحریریں نہایت کروفر کے ساتھ الشریعہ میں شائع ہوتی ہیں۔ انتشار پھیلانے کے اس عمل کو وہ آزادانہ رائے اور علمی ترقی کہتے ہیں۔ موصوف جاوید غامدی صاحب کے نظریات اپنے صاحبزادے کے سایے میں پھیلانے کا کام کررہے ہیں۔ تجدید دین کے نام پر تجدد عام ہورہا ہے۔

مولانا کے مضمون کے مطالعے کے بعد درج ذیل مفروضات ہمارے سامنے آئے ہیں جن کا خلاصہ مولانا وحید الدین صاحب کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

(۱) جدید مغربی فکر سائنٹفک فکر ہی ہے یعنی مغربی فکر سائنٹفک فکر میں مقید ہے۔

(۲) سائنس ایک غیر اقداری علم ہے۔

(۳) فکر مغرب (جوکہ مولانا کے نزدیک سائنس وٹیکنالوجی ہی کا نام ہے) کا اسلام سے تعلق مخاصمانہ نہیں بلکہ مفاہمانہ ہے یعنی سائنسی علمیت اوروحی میں کسی قسم کا کوئی تعارض نہیں۔

(۴) سائنسی علم عالم اسلام کے لیے تائیدی علم کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۵) مسلمانوں کا رویہ فکر مغرب کے حوالے سے معتصبانہ ہے۔اگر آج مسلمانوں کو مغربی فکر میں خامیاں نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ مغرب کا miss use اور Interpretation ہے جیسے اسلامی تاریخی میں بھی کئی مقامات پر فکر اسلامی کا غلط استعمال ہو اور نہ فکر مغرب اپنی اصل میں عین اسلامی ہے

(۶) جدید مغربی تہذیب درحقیقت منصوبۂ خداوندی ہے۔

یہ ہیں مولانا کے وہ مفروضات جن پر وہ اپنی فکر کی پوری عمارت کھڑی کرتے نظر آتے ہیں۔مولانا نے اپنے ان مفروضات کو ثابت کرنے کے لیے حسبِ عادت کسی اہم یا بڑے مغربی مفکر یا کسی کتاب اور انسائیکلو پیڈیا کا حوالہ نہیں دیا۔مولانا نے چشم تصور میں مغرب کو جو کچھ سمجھا اسے خیال آرائی اور رعنائی بیان کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کردیا۔جواب حاضر خدمت ہے۔

یہ خیال کہ جدید مغربی فکر Scientific thinking ہی کا نام ہے،ایک غیر علمی استدلال ہے۔فلسفہ محض عقلی سرگرمی ہے یہ تجربے کے بغیر علم ہے اور سائنسی علم تجربے،عقلیت،مشاہدے اور ریاضی کی زبان کے بغیر سائنسی علم نہیں کہلا سکتا۔ہم مولانا جیسے دانش ور سے اس قدر طفلانہ علمی جسارت کی توقع نہیں رکھتے تھے۔فکر مغرب کو اس کی تاریخ،تہذیب اور مابعدالطبیعیات سے کاٹ کر محض سائنسی غار میں مقید کردینا غیر علمی رویہ ہے۔اپنے اس غیر علمی دعوے کے لیے کسی مغربی مفکر کی کتاب کا حوالہ دینا تو دور کی بات ہے مولانا نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کوئی عقلی اور منطقی دلیل بھی نہیں دی۔

مولانا کے اس طرز استدلال سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فکر مغرب سے ماہرانہ واقفیت نہیں رکھتے مگر اس کے باوجود وہ مغرب پر کلام کرنا،اس پر کتابیں تحریر کرنا اور مغرب کے کفر کے حق میں عالم اسلام میں رائے عامہ ہموار کرنے کو اپنا اولین حق سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنے پورے مضمون میں فکر مغرب پر فقط ایک سطر تحریر کی ہے اور وہ یہی ہے کہ مغربی فکر سائنسی فکر کا نام ہے۔باقی ان کا پورا مضمون سائنس وٹکنالوجی پر مشتمل ہے۔سائنسی فکر پر تو ہم آگے چل کر کلام کریں گے مگر پہلے مولانا کی خدمت میں عرض ہے کہ جدید مغربی فکر کی ابتدا جدید سائنس سے نہیں بلکہ جدید فلسفے سے ہوتی ہے جس کا سفر ایک خاص تصور انسان،تصور کائنات اور تصور علمیت سے شروع ہوتا ہے۔جدید سائنس درحقیقت انسانی ذہن کے مابعدالطبیعیاتی سطح پر تبدیل ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوئی یعنی جدید سائنس کوئی خلا کی تخلیق نہیں جس کی کوئی مابعدالطبیعیات نہ ہو۔مولانا اور قارئین البرہان کے لیے سب سے پہلے جدید مغربی فکر کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی سے پہلے سائنس فلسفہ کی شاخ تھی اور سائنس داں کو سائنس داں نہیں بلکہ فطرت کا فلسفی (نیچرل فلاسفر) کہا جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے بعد جدید فلسفے کے آغاز کے بعد جب علمیت کے ذرائع کو مابعد الطبیعیات پر مقدم کیا گیا اور کانٹ نے مابعد الطبیعیات کے علم کے حصول کو موجود میسر ذرائع علم کے ذریعے ناممکن الحصول قرار دیا تو حاضر و موجود، طبیعیات، حواس اور تجربے وعقل پر مبنی علم ہی اصل علم قرار پایا جس کے نتیجے میں جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ یہ وہ علمی مسلمات ہیں جو فلسفے کے ایک عام طالب علم کو کسی بھی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں داخلہ لیتے ہی معلوم ہو جاتے ہیں حیرت ہے کہ مولانا ان مسلمات سے ناواقف ہیں۔ اگر وہ فلسفے کے تعارف پر مبنی درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کر لیتے تو اس قدر کمزور مضمون نہ لکھتے۔ واضح رہے کہ یہ کتابیں مغرب میں ابتدائی جماعت کے طلباء پڑھتے ہیں:

1- *A little history of Philosophy,* N. Warburton

2- *Essays on Freedom,* N. Warburton

مغربی فکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: (۱) جدیدیت [Modernism] اور (۲) پس جدیدیت [Post Modernism]

جدیدیت کا آغاز مغرب کی فکری تاریخ میں سترہویں صدی سے شروع ہوتا ہے جب انسان نے خود کو خدا کے منصب پر فائز کر دیا اور وہ کسی کا عبد نہ رہا- جدیدیت درحقیقت اسی روشن خیالی سے معمور اور فسق و فجور اور کفر سے بھرپور انسان کی دریافت کا نام ہے جب انسان رہبری و رہنمائی کے لیے کسی خارجی ذریعے کا محتاج نہ رہا۔ جدیدیت نے انسان کو قائم بالذات ہستی کے طور پر پیش کیا جو کسی خارجی مقتدرہ سے (external authority)، جس کے پاس رہنمائی کا سرچشمہ عقل کی صورت میں موجود نہیں، رہنمائی پانے کی بجائے پیغمبر باطن سے، جو عقل کی صورت میں موجود ہے، ہدایت پائے گا۔ یوں انسان نے تاریخ انسانی میں پہلی بار اپنے خدا ہونے کا خود اعلان کیا۔ اس ضمن میں ڈیکارٹ کو اگر ہم مغربی فکر کا بانی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈیکارٹ نے نہ صرف ایک نئے جدید اقداری ڈھانچے کا تعین کیا بلکہ عیسائی دنیا میں موجود بچی کھچی مذہبیت کو بھی علمی بنیادوں پر اکھاڑ پھینکا۔ ڈیکارٹ نے وجود انسانی کے ادراک میں کسی بھی خارجی عامل کے کردار کو رد کر دیا۔ اس نے [Self knowledge] کے لیے خالص عقلی دلیل دی۔ اس کے مطابق انسان علمی بنیادوں پر اپنے سوا، خواہ وہ کوئی معیارات خیر و شر ہوں یا وحی ہو، ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ اکیلی میری اپنی ذات، میرا اپنا وجود شک سے بالاتر ہے۔ اس کا ایک مشہور جملہ ہے 'I think therefore I am' یعنی میں سوچتا ہوں، اس لیے کہ میں ہوں۔ میں اپنے وجود اور اپنے ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہوں اور اس کے لیے میں کسی خارجی ذرائع کا محتاج نہیں۔

ڈیکارٹ نے اپنے ان نظریات سے ثابت کر دیا کہ انسان کے سوا کائنات کے اندر اور کائنات سے باہر ہر چیز پر شک کیا جا سکتا ہے اگر نہیں کیا جا سکتا تو صرف میری ذات (انسان) پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ عیسائیت کا یہ دعویٰ تھا کہ سچائی ایک ہے جسے انسان جنم نہیں دیتا بلکہ وحی کے ذریعے دریافت کر سکتا ہے اور اگر آپ نے وحی کا انکار کر دیا تو آپ سچائی نہیں جان سکتے اور یہی تمام مذاہب عالم کا مشترکہ موقف ہے جب کہ جدیدیت نے حقیقت تک پہنچنے کے لیے جو دعویٰ کیا وہ یہ تھا کہ وحی کوئی آخری ذریعۂ علم نہیں ہے کیونکہ یہ علم وحی عقلیت اور تجربیت (Rationalism & Empiricism) کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ وحی کے لیے پیغمبر کا دعویٰ ایک فرد کا ایسا دعویٰ ہے جس کا تجربہ کوئی اور نہیں کر سکتا لہٰذا یہ دائرہ علم سے باہر کا علم ہے۔ انسان کے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں جن پر انحصار کر کے وہ حقیقت کو جان سکتا ہے مثلاً عقل، وجدان، حواس، تجربات اور مشاہدات حصول حق کے لیے کافی ہیں۔ اس کے لیے کسی خارجی ذریعے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے یہ نقطۂ نظر تاریخ فکر و فلسفہ میں بنیادی تبدیلی کی نشان دہی کرتا ہے۔

ڈیکارٹ کے فلسفے کی روشنی میں حقیقت مطلق [Absolute Reality] خدا کی بجائے انسان کی ہستی قرار پائی۔ ڈیکارٹ کی فکر سے پہلے تاریخ انسانی کی ہر تہذیب میں مابعد الطبیعیات سے علمیت نکلتی تھی جبکہ ڈیکارٹ کے اس نظریے کے بعد علمیت سے مابعد الطبیعیات کا ظہور ہوا۔ ظاہر ہے حواس خمسہ، عقلیت، تجربیت اور ریاضی کی زبان پر مبنی علمیت کے ذریعے جو مابعد الطبیعیات نکلی وہ ہائیڈیگر کے الفاظ میں حاضر و موجود کی مابعد الطبیعیات [Metaphysics of Presence] تھی یعنی ذات انسانی اور اس سے صادر ہونے والا حاضر و موجود کا علم ہی اصل العلوم قرار پایا لہٰذا اس بنیادی فکری انقلاب [Great Transformation] یا [Glorious Revolution] کے نتیجے میں حاضر و موجود، حواس خمسہ، تجربات سے متعلق علم سائنس نے غیر معمولی ترقی کی اور مسلسل ارتقاء کی منزلوں سے گزر رہی ہے۔ افسوس کہ مولانا وحید الدین سائنس کے پس پشت فلسفیانہ اساسات سے بے خبر ہیں۔

یوں تو جدیدیت کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں لیکن جدیدیت کی بنیادی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں

(۱) انسان کائنات کا مرکز ہے [Anthropocentricity]

(۲) آزادی ایک اساسی عقیدہ ہے [Freedom is Ideal]

(۳) مساوات بنیادی قدر ہے [Equality is Value]

(۴) عقلیت معیار ہے [Reason is the Criteria]

(۵) انسان ہدایت، رہنمائی اور روشنی کے لیے کسی خارجی ذریعۂ علم کا محتاج نہیں۔ اس کی عقل، وجدان، اس کا اندرون روشنی کے لیے کافی ہے۔ وہ علم میں خود کفیل ہے۔

(٦) چونکہ انسان مابعد الطبیعیات کا علم موجود و میسر ذرائع علم سے حاصل نہیں کر سکتا لہٰذا مابعد الطبیعیات کا علم ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ اس علم کی تصدیق ممکن نہیں اور اس کی تردید اور اس علم میں شک اہل دین کے لیے قابلِ قبول نہیں جب کہ علم وہ ہے جس میں شک کیا جا سکے، جس کی تردید کی جا سکے۔ چونکہ وحی الٰہی، دینی علم اور روایتی علم ان معیارات پر پورا نہیں اترتا لہٰذا وہ علم نہیں جہالت ہے۔

جدیدیت نے چونکہ وجود انسانی ہی کو شک و شبہ سے بالا تر پایا لہٰذا انسان پرستی [Humanism] ہی عہد جدید کا مذہب قرار پایا۔ انسان پرستی کی عمدہ تشریح ہمیں کانٹ کے مضمون What Is Enlightenment? میں ملتی ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ انسان ایک فاعل خود مختار، ہدایت و روشنی میں خود کفیل اور خارجی ہدایت سے ماوراء ایک مطلق آزاد انسان ہے کانٹ کے مطابق

Enlightement is man's emergence from his self imposed immaturity.
Immaturity is the inability to use ones understading without gudiance from another.

کانٹ اس مضمون میں یہ بھی لکھتا ہے کہ روشن خیال شخص وہ ہے جو وحی، پادری اور ڈاکٹر کے احکام ماننے سے انکار کر دے۔ کانٹ جو جدیدیت کا سب سے بڑا فلسفی ہے، لکھ رہا ہے کہ وحی کے علم سے روشنی لینے والا نہ روشن خیال ہے نہ انسان ہے کیونکہ وہ اپنی انسانیت، اپنی عظمت اور اپنے حق خود اختیاری کا انکار کر رہا ہے۔ انسان کسی کا بندہ نہیں وہ خود خدا ہے۔ وہ اپنی ذات میں احد و صمد ہے۔ وہ کسی اور مقصد کا ذریعہ نہیں بلکہ خود مقصد ہے۔ یعنی کوئی کام انسان یہ سمجھ کر نہ کرے کہ وہ کسی اور مقصد کا ذریعہ ہے بلکہ وہ مقصود بالذات ہے یعنی انسان کسی کا آلہ کار نہیں بلکہ خود صاحب ارادہ ہستی ہے جس کا مقصد اپنے ہی ارادہ کی پیروی ہے۔ اس طرح کانٹ نے کائنات کو خدا مرکز (God centric) کی بجائے انسان (Human centeric) قرار دے دیا۔ کانٹ کے اس فلسفے پر مزید شرح و بسط کے ساتھ ہم اگلے مضمون جدید سائنس و ٹکنالوجی کے ضمن میں تفصیلی بحث کریں گے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کانٹ اور ماڈرن ازم تمام مذاہب کا انکار کر رہے ہیں اور مولانا وحید الدین خاں صاحب ثابت کر رہے ہیں کہ اسلام اور مغرب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روشن خیالی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصل

حقیقت سے واقف ہی نہیں اور انہوں نے اس موضوع پر سب سے بڑے فلسفی کانٹ کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔

انسایت پرستی کے نظریے کے عملی اظہار کے لیے جدیدیت کے منہاج میں جس عقیدے پر ایمان لانا ضروری ہے وہ آزادی [Freedom] ہے آزادی کا معنی ہے کہ تعین خیر وشر کا حق یعنی خیر کی تعریف متعین کرنا انسان کا حق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خیر وشر تخلیق کرنے کا حق ہر انسان کو ہونا چاہیے قطع نظر اس سے کہ فرد اس حق کو استعمال کر کے اپنے خیر وشر کا کون سا پیمانہ طے کرتا ہے کیونکہ اصل خیر [Good] یہی ہے کہ انسان خود خیر وشر کے تعین کرنے کا مجاز ہے [Man is creater of Good & Evil] مغربی مفکرین کے مطابق انسان اصولاً آزاد ہے مگر عملاً آزاد نہیں یعنی اس پر سماجی، ثقافتی، مذہبی، روایتی، رواجی، اخلاقی اور دینی پابندیاں عائد ہیں یعنی آزادی کا مطلب لامحدود خواہشات کی تکمیل کو عقل کا تقاضا ماننا ہے۔ البتہ مغربی مفکرین میں اس امر میں سخت اختلاف ہے کہ انسان زیادہ آزاد کس نظم معاشرت میں ہوسکتا ہے۔ یہاں مغربی فکر کا تصورِ آزادی دو شکلوں میں تقسیم ہو جاتا ہے (۱) لبرل ازم، (۲) کمیونٹیرین ازم

لبرل ازم کا تصورِ آزادی انفرادیت پرستی [Individualism] کے گرد گھومتا ہے جبکہ کمیونیٹرین کا تصورِ آزادی اجتماعیت [Collectivity] کے گرد گھومتا ہے سوشلزم اور نیشنلزم کمیونیٹیرین فکر ہی کی جانشین تحریکیں ہیں۔

۱۶ ویں صدی میں یورپ میں ان دو ہمہ گیر تحریکوں کو فروغ ملا۔ یہ دونوں تحریکیں اپنا الگ مقصد حیات اور تصور انسان پیش کرتی ہیں۔ ان دونوں تحریکوں نے انسانی ترقی کو اس بات پر منحصر کر دیا ہے کہ انسان کو کتنا آزاد ہونا چاہیے۔ دونوں کا ایمان اس بات پر ہے کہ کسی معاشرے کے اولین قیام کا مقصد حصول آزادی ہے۔ آزادی مقصود بالذات ہے نہ کہ آزادی کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ دونوں فکریں انسان پرستی کی مختلف شکلیں ہیں لیکن عصر حاضر میں رائج و غالب تعقل لبرل تصور آزادی ہے جو ہیومن رائٹس کی شکل میں دنیا کے تقریباً ہر دستور کا حصہ ہے۔ آزادی کے اس تصور پر ایمان لانے کے بعد مساوات کا عقیدہ سمجھنا قدرے آسان ہے۔ چونکہ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے قدر کا جو پیمانہ چاہے طے کرے لہٰذا ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ دوسروں کے اس مساوی حق کو تسلیم کرے یعنی ہر شخص کے تعین قدر کو ترتیب میں یکساں اہمیت دی جائے۔ کیونکہ انسان خود مختار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان آزاد کب ہوگا؟ تو جدید مغربی فلسفیوں کے خیال میں انسان آزاد اس وقت ہوگا جب وہ اپنی عقل پر مکمل انحصار کرے گا یعنی آزادی کا نصب العین عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے یعنی وہ Faculty of

reason کو استعمال کرے۔

مختصراً یہ کہ جدیدیت نے دعویٰ کیا کہ سچائی تک پہنچنے کے لیے وحی کا ذریعہ معتبر ذریعہ نہیں۔ انسان عقل، وجدان، حواس، تجربات اور مشاہدات سے بھی حق پا سکتا ہے۔ حصول حقیقت کے لیے کسی خارجی ذریعے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت حصول حق کے لیے خارجی ذریعے کا انکار ہی انسانی ذہن کی وہ مابعد الطبیعیاتی تبدیلی ہے جس پر ہمیں پوری مغربی فکر کی عمارت کھڑی نظر آتی ہے مگر مولانا وحیدالدین خان صاحب اس کافرانہ مغربی فکر کو عین اسلام کا عکس، نقش اور چربہ قرار دے رہے ہیں جبکہ جدیدیت درحقیت وحی کی علمیت کو جہالت و جاہلیت قرار دیتی ہے۔

جدیدیت کے مختصر تعارف کے بعد اب ہم پس جدیدیت کی فکر کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں۔ پس جدیدیت کی کوئی جامع تعریف کرنا اتنا آسان نہیں البتہ پس جدیدی فکر میں ہمیں جدیدیت کے برعکس رجحان نظر آتا ہے۔

جدیدیت کو سمجھ لینے کے بعد پس جدیدیت کو سمجھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ ایک طرف تو یہ جدیدیت کے فکری تسلسل کا ہی نام ہے اور مشکل اس لیے کہ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور جدیدیت کی فکری بنیادوں کی مخالف اور اس سے مختلف تحریک ہے۔ ہیبر ماس کا مشہور جملہ اس صورتحال کی خوبصورت ترجمانی کرتا ہے "There is modrenity after post modrenity" یعنی پس جدیدیت کی فکری تحریک اصلاً جدیدیت کی ہی توسیع ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر عرض کر آئے کہ جدیدیت کی اساس عقل پر تھی۔ ایجابی علوم کی بالادستی دلیل، ثبوت اور شہادت عقلیت کے پیمانے پر تھی۔ پس جدیدیت دراصل جدیدیت کے برعکس بیسویں صدی کے آخری عشروں کا فکری مظہر ہے۔ پس جدید مفکرین نے جدیدیت کے تمام دعووں کی مطلقیت [absolutness] اور آفاقیت [universality] کو برے طریقے سے رد کر دیا۔ رچرڈ رارٹی آفاقی الحق، سچ، الخیر کا انکار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> There is no truth. What could that mean? Why should any body say it? Actually almost nobody [except Wallace Stevens] does it. but Philosophers like me are often said to say it. For we have learned [from Nietzsche, and James among others] to be suspicious of the appearance- reality distinction. So we suggest that the appearance reality distinction be dropped in favor of a distinction between less useful and more useful ways of taking. [Truth and

Progress Introduction Page-I Cambridge Press Vol.3]
This will look like an argument that there is no truth. [p2]
Truth is to be sure an absolute notion in the following sense: "True for me but not for you" and "True is my culture but not in yours" are weird pointless locutions. So is "true then, but not now".
There is no such thing as a belief that can be known once and for all to be indubitable.
But there are no beliefs that can be known to be immune to all possible doubts. [p2].

جدیدیت نے حقیقت کے لیے عقل اور تجربیت پر اعتماد کرنے کی دعوت تو دی مگر ساتھ ہی یہ کہا کہ حقیقت کا حتمی ادراک ممکن ہی نہیں۔ جدیدیت کے اس دعوے پر کہ حتمی حقیقت کا ادراک ممکن نہیں پس جدیدیت مفکرین کا کہنا ہے کہ جب حتمی حقیقت معلوم ہی نہیں ہوسکتی تو یہ کیسے طے ہوگا کہ جس عقلیت اور تجربیت کے نتائج پر ہم عمل پیرا ہیں وہ ہمیں حقیقت کے قریب کر رہا ہے یا دور۔ یعنی جب منزل کا ملنا ہی ناممکن ٹھہرا تو اس بات کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے کہ کس طرح دوڑا جائے۔ یہی وہ سوالات ہیں جن کا جدید مفکرین کے پاس کوئی جواب تھا اور نہ ہی جواب ہوسکتا ہے۔ اس فکر نے صرف جدید کا نقد اور رد ہی نہیں کیا بلکہ حتمی حقیقت کے وجود وحی کا انکار کرڈالا یعنی حقیقت ایک اضافی شے بن گئی [Reality is a relative term]، لیوٹارڈ (Lyotard) پس جدیدیت کے بارے میں لکھتا ہے:

Simplifying the Postmodernism incredulity towards metanarratives (Post Modern Condition)

لہٰذا حقیقت [Reality] ہر فرد، معاشرے اور زمانے کے لیے مختلف ہوسکتی ہے لہٰذا کسی خیر [Good] اور الحق [Truth] کے کوئی معنی نہیں چنانچہ کسی خیال، کسی جذبہ کے کوئی معانی نہیں لہٰذا کسی قدر، کسی سوچ، کسی گفتگو اور کسی خواہش کے کوئی معانی نہیں۔ نتیجتاً آج ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی تہذیب ایک عظیم بے معنویت کی لپیٹ میں آچکی ہے اور بے معنویت کا سیلاب مغرب کی تہذیب تاریخ ثقافت روایات، مذہب، سماجی اداروں، ریاست اور ریاستی اداروں اور ہر چیز کو بہا کر لے گیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ پس جدیدیت نے جدیدیت کے عقلی بنیادوں پر آفاقی دعووں اور مہابیانیوں Modern Grand Narratives کو برے طریقے سے رد کر دیا ہے۔ اپنے ان خیالات کے باعث پس جدید مفکرین کو post structurlist اور Anti Foundationalist بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ کسی بھی قسم کے اقدار، خیر، الحق پر قائم اداراتی ڈھانچے کی انسان پر بالادستی کے مخالف ہیں اور خصوصاً جدیدیت

کے پیدا کردہ اداروں کو انسان پر تاریخ کا ایک عظیم جبر قرار دیتے ہیں لیکن پس جدیدیت ہمیں جدیدیت کا متبادل فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ بلاشبہ اس نے جدیدیت کی آفاقیت اور معنویت کو ختم کر دیا ہے لہٰذا فکر مغرب میں اب عقلیت کی بنیاد پر معنویت تلاش کرنا ممکن ہی نہیں جبکہ مولانا وحیدالدین خاں فکر اسلامی کو فکر مغرب کا چربہ قرار دے کر اس بے معنی تہذیب کو معنی فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔ مولانا فکرِ اسلامی کی مغربی تہذیب سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے اپنے مضمون میں ہمیں دعویٰ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اسلام ایک عقلی مذہب ہے مگر وہ اس بات سے ناواقف ہیں کہ ان کی ممدوح فکرِ مغرب ہی نے عقل کی آفاقیت کو رد کر دیا ہے۔ فوکالٹ، دریدا، لیوٹارڈ اور رچرڈ رارٹی کا شمار اس فکر کے صف اول کے مفکرین میں ہوتا ہے۔

مولانا وحیدالدین خان پس جدید مفکرین کی جدید اداروں، جدید فلسفے اور جدید سائنس پر تنقید سے بھی ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ جدید مغربی فکر کانٹ سے لے کر ڈیلوز تک کتنے موڑ مڑ چکی ہے۔

سترہویں و اٹھارہویں صدی کی فرسودہ عقلیت کے مسترد فلسفے کا سہارا لے کر اور اسلام کو عقلی مذہب ثابت کر کے اپنے زعم میں مولانا نہایت اخلاص سے اسلام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ عالم اسلام میں یہی کام راشد شاذ، جاوید غامدی، زاہدالراشدی، حافظ شکیل اوج، ڈاکٹر خالد مسعود، عمار ناصر حسن البنا کے نبیرہ ڈاکٹر طارق رمضان اور حزب وسط مصر کے مفکرین کر رہے ہیں۔ یہ سب جدیدیت اور پس جدیدیت کے فلسفیانہ مباحث میں عقلیت کی بحث سے ناواقف ہیں۔ مغرب کے فلسفے سے بے بہرہ ان مخلص لوگوں کو معلوم نہیں کہ جدید عقلیت کا فلسفہ علمی دنیا میں انتہائی برے طریقے سے رد ہو چکا ہے لیکن مولانا اور ان کے ہم خیال مفکرین اٹھارہویں انیسوی صدی کی مغربی فکر کا راگ الاپ رہے ہیں۔ وہ اس علمی بحران سے نا آشنا ہیں جس کے باعث مغربی تہذیب اپنی فکری بنیادوں مثلاً اپنے مخصوص تصور انسان، تصور خیر اور مقصد حیات کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوششوں سے رجوع کر چکی ہے۔ ان حالات میں مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنے کے امکانات جتنے آج موجود ہیں پہلے کبھی نہ تھے۔ ہم مولانا جیسے مخلص مفکر کے لیے مغرب پر چند مصادر کی مختصر فہرست پیش کرتے ہیں جسے پڑھ کر شاید وہ سمجھ سکیں کہ فکر مغرب اپنی اصل میں کیا ہے؟

- *History of Modern Western Philosophy* (Brian Duignan)
- *Post Stucturalism and post modernism* (Modhon Surup)
- *Post Modernism an Introduction* (Oxford University Press)
- *Science and Modern World* (White Head)

- *The Philosophical Discourse of Modernity* (Haber Mass)

عالم اسلام کے ممتاز مفکر و فلسفی ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے اردو اور انگریزی میں جدیدیت، پس جدیدیت اور فکر مغرب کا رد کرتے ہوئے بہت کچھ لکھا ہے وہ لندن اسکول آف اکنامکس کے وزٹنگ پروفیسر بھی ہیں۔ بائیں بازو کے ممتاز علمی جریدے New Left لندن کے ماہرین کے پینل میں شامل ہیں جن کی آراء سے مضامین کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر صاحب کی درج ذیل کتابیں خان صاحب پڑھ لیں جو نسبتاً آسان ہیں:

1) *Business Ethics in Pakistan*

2) *A Case Against Capitalism* published in *Jareeda* 29 published by Burau of Composition, Compilation and Translation, University of Karachi

۳) خطبات لاہور، جامعہ پنجاب، شیخ زائد اسلامک سینٹر

۴) ماہنامہ ساحل جنوری ۲۰۰۵ء مغربی فکر کا محاکمہ

۵)اسلام اور سرمایہ داری مرتبہ محمد احمد حافظ

۶)اسلام اور جمہوریت مرتبہ زاہد صدیق مغل

۷) ماہنامہ ساحل کراچی میں ڈاکٹر صاحب کے بے شمار اردو مضامین فکر مغرب کے رد میں شایع ہوئے ہیں

۸) ماہنامہ ہمقدم کا مغربی تہذیب۔فکر و فلسفہ نمبر جس میں مغرب کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

۹) ماہ نامہ سنابل کراچی میں ڈاکٹر صاحب نے مغربی نظریات پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے تین اہم شاگردوں ڈاکٹر علی محمد رضوی، ڈاکٹر عبدالوہاب سوری اور ڈاکٹر زاہد صدیق مغل کے بہت سے انگریزی اور اردو مقالے ان مباحث کا علمی احاطہ کرتے ہیں۔

اگر مولانا کے پاس ان کتابوں کو پڑھنے کا وقت نہ ہو تو وہ صرف کانٹ کا دس صفحات کا مضمون What is Enlightenment? انٹرنیٹ پر پڑھ لیں۔ جدیدیت اور مغربی فکر و فلسفے کے اہم ترین اور سب سے بڑے فلسفی کا یہ مضمون فکر مغرب کی قلعی کھول دینے کے لیے کافی ہے۔اس مضمون کے سو سال بعد اس صدی کے ایک بڑے فلسفی فوکالٹ نے What is Enlightenment? کے نام سے کانٹ کے مضمون کی شرح لکھی ہے جس میں وہ بتاتا ہے کہ کانٹ نے اپنے مضمون What is Enlightment? میں عقل اور دلیل کو آخری حجت تسلیم کیا ہے اور عقل کسی خارجی ذریعے اور اتھارٹی

کے بغیر ہی کام کرتی ہے۔فوکالٹ لکھتا ہے:

Kant in fact describes Enlightenment as the moment when humanity is going to put its own reason to use, without subjecting itself to any authority. [Michel Foucault, *The Foucault Reader*, [ed. Paul Rabinow], Pantheon Books, 1984, p.38]

خلاصۂ کلام:

ہماری اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ فکر مغرب اصل میں مذہب دشمن ،خدا دشمن اور روایت دشمن تہذیب ہے جو کسی اتھارٹی کو تسلیم نہیں کرتی یہ اسلام دشمن فکر ہے۔ اس فکر میں نہ کسی علیم وقدیر خدا کے خوف کے لیے گنجائش ہے نہ نبوت اور وحی والہام کی ہدایت کا کوئی وزن۔ نہ موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور، نہ حیات دنیا کے اعمال پر محاسبے کا کوئی کھٹکا، نہ انسان کی ذاتی ذمہ داری کا کوئی سوال۔مغربی تہذیب میں اسلامی اخلاقیات مثلاً للّٰہیت،عشق رسول،شوق عبادت ،خوف آخرت ،طہارت،تقوی،عفت ،حیا،ایثار،توکل،صبر،تفکر،غنا،قناعت،عزیمت وغیرہ کے پنپنے کا کوئی امکان موجود نہیں۔یعنی اسلام جن اخلاقیات پر اپنی معاشرتی صف بندی کی بنیاد رکھتا ہے یہ تہذیب انھیں اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہے اور مغربی فکر جن بنیادوں پر اپنی تہذیب کی عمارت قائم کرتی ہے اسلام کی عمارت اس پر ایک لمحے کے لیے بھی قائم نہیں ہوسکتی یعنی یہ دونوں کشتیاں بالکل مخالف سمت میں سفر کر رہی ہیں۔ہم اگلی قسط میں مولانا کے سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق مفروضوں اور غلط فہمیوں کا جائزہ لیں گے،ان شاء اللہ۔

تفہیم مغرب　　　ڈاکٹر عبدالرؤف نظامی☆

جمہوریّت - ایک یہودی پھندا

ڈاکٹر عبدالرؤف نظامی صاحب نے ہمیں جمہوریت کے نام پر یہودی ومغربی ہتھکنڈوں اور ان کے

مقابلے میں دینی عناصر کی نارسائیوں پر ایک طویل اور تفصیلی مضمون بھیجا ہے جس کی زبان بھی سخت ہے۔ڈاکٹر صاحب سے معذرت کے ساتھ ہم اس مضمون کا ابتدائیہ اور اختتامیہ یہاں دے رہے ہیں تا کہ قارئین کو ڈاکٹر صاحب کے موقف کا کچھ اندازہ ہو سکے۔مدیر

اللہ تعالیٰ مجدہ کریم کی جلالت مآب مشیّت کا پے در پے طاقتور اظہار دجل وفریب کے لبادے میں لپٹے، تمام بنی نوعِ انسان کا بدترین استحصال کرنے کی غرض سے بڑی چالاکی اور عیّاری کے ساتھ تخلیق کیے گئے جمہوری نظام کا پردہ چاک کر رہا ہے۔مسلمان ہونے کے ناطے ہم صرف عالمِ اسلام کی بات نہیں کرتے بلکہ الہامی کتابِ عظیم قرآنِ کریم کی فکر و دانش کی روشنی میں پورے عالمِ انسانیت کی فلاح و بہبود اور نجات کی بات کرتے ہیں۔گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں یہودی ساہوکاروں اور انفرادی و اشتراکی سرمایہ داروں نے احساسِ مروّت کو کچل دینے والی مشینوں، مہلک گولہ و بارود، انسانیت کے پرخچے اڑا دینے والے اسلحے، توپ وتفنگ اور ہنستے بستے شہروں، یعنی جاپان کے ہیروشیما اور ناگاساکی کو ملیامیٹ کرنے والے ایٹمی بموں کے ذریعے بلا امتیازِ رنگ ونسل و مذہب عالمی سطح پر بنی نوعِ انسان کی قتل وغارت گری (پہلی اور دوسری جنگِ عظیم) کے ذریعے تباہ حال اور ڈرے سہمے دنیا بھر کے انسانوں پر جمہوریّت نامی بدترین استحصالی نظام مسلّط کر دیا۔عالمِ انسانیت کے لیے جبر واستبداد پر مبنی اس قابلِ نفرت جمہوری طرزِ حکومت کے عیوب واستحصال کو آزادیٔ افکار اور انسانی برابری جیسے جعلی مگر خوشنما نعروں میں چھپانے کی کوشش کی۔تسلیم کیجیے کہ یہودی استعمار کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔عام انسان مجموعی طور پر اس دجل وفریب کا اب تک شکار ہیں۔تاہم'آنکھیں' رکھنے والے اصحاب ورجال ہر دور میں عالمِ انسانیت کو اس فکری جال اور پھندے میں پھنسنے سے بچانے کے لیے اپنی سی کوششیں کرتے رہے۔دنیا کے اس خطے برصغیر پاک وہند میں ایک نہایت توانا فکری آواز، علامہ اقبالؒ کی حق آگاہ شخصیت نے اس حوالے سے بلند آہنگ آگاہی کا فریضہ ادا کیا۔جمہوریّت نامی ابلیسی مغالطے کے حوالے سے شاعرِ مشرقؒ کی فکر و دانش میں فکری ارتقاء کا نام ونشان تو ملتا ہے، البتہ ان کے اردو اور فارسی کلام میں کسی مداہنت اور

☆ شعبۂ ارضیات، جامعہ پنجاب، لاہور

کسی وقتی و عارضی تدبیر کے طور پر اس یہودی پھندے، جمہوریّت کو اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ملتا بلکہ اس پر سخت تنقید ملتی ہے اور بڑے زبردست دلائل کے ساتھ ''ردِّ جمہوریّت'' کا پیغام ملتا ہے۔اس حوالے سے اُن کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

جمہوریت اک ایسا طرزِ حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

....

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد، جمہوری قباء میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
گرمیِ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

ان اشعار میں علامہ اقبالؒ نے 'طرزِ حکومت'، 'گنا کرتے ہیں' 'تولا نہیں کرتے'، 'نوائے قیصری'، 'دیوِ استبداد'، 'جمہوری قباء'، 'پائے کوب'، 'آزادی کی نیلم پری' اور 'جنگِ زرگری' ایسے اظہارات کے ذریعے اس یہودی پھندے کی ابلیسی قباء چاک کر کے رکھ دی ہے۔ قارئین! آیئے میرے ساتھ اس اجمال کی تفصیل جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

باون سال قبل ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ایک بڑا دلچسپ فکری مغالطہ اور کنفیوژن بصد علمی سعی و جہد دانش و حکمت کے حامل اشرافیہ میں پروان چڑھایا گیا۔ کوئی 'بڑی آواز' بلند ہو جائے تو اس کے پیچھے رو میں بہہ کر دوسری بہت سی چھوٹی بڑی آوازیں بھی اُٹھنے لگتی ہیں۔ سابق سویت یونین (روس) ایک سپر پاور کی حیثیت میں اُس زمانے میں کمیونزم اور سوشلزم کی اشاعت و ترویج کے لیے بڑے جارحانہ انداز میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ وطنِ عزیز بطورِ خاص اس کا نشانہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں سوشلزم کو ایک کرشماتی اور متحرک سیاسی رہنما ملا تو اس مملکتِ خداداد کے طاقتور اجتماعی ضمیر (نظریۂ اسلام) سے نفسیاتی خوف زدگی کی بنا پر سوشلزم کو قابلِ قبول بنانے کے لیے اس نے بڑی فطانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے 'اسلامی سوشلزم' کا نعرہ بلند کیا۔ پڑھے لکھے افراد اور عوام الناس میں سوشلزم اس پیوند کے ساتھ تیزی سے مقبول ہونے لگا۔ ایسے میں الحاد اور لادینیت کے اس سیلاب کے سامنے سیّد مودودیؒ کی بلند آہنگ فکری و علمی کاوشیں ایک مضبوط دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔ یہ اور متعدد اُن کی دوسری دینی و فکری خدمات تب سے اب تک اور آنے والے زمانے میں بھی مینارۂ نور بن کر رہنمائی کرتی رہیں گی۔ 'چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک' کے مصداق اُن کی مجدّدانہ اور عالمانہ شان کے سامنے راقم کی حیثیت ذرّہ ریگ سے بھی کم تر ہے۔ تاہم اُن کی عطا کردہ فکری رہنمائی اور اعتماد کے بل پر راقم یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہے (جب کہ حبطِ اعمال کا خوف بھی دامن گیر ہے) کہ ماچھی گوٹھ میں منعقدہ تفصیلی غور و فکر اور مباحث کی

مجالس میں سیّد مودودیؒ کا فیصلہ، جمہوریّت ایسے لادینی نظریے اور عالمِ انسانیت کا استحصال کرنے کے لیے تیار کردہ یہودی پھندے کے حق میں درست نہ تھا۔ یہ فیصلہ جمہوریت کو ’وقتی اور عبوری راستے‘ کے طور پر اختیار کرنے کے حق میں ’تولنے‘ کے بجائے ’اُسی‘ گنا کرتے ہیں‘ کے اصول پر کیا گیا۔ آپ جانئے کہ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی یا کچھ اور کہ یہ فیصلہ آنے والے تیزی سے بدلتے حالات (مشینی اور کمپیوٹری ابلاغ کی ہمہ پہلو ترقی و ترویج کی صورت) میں نظریۂ اسلام کے غلبے کے لیے کام کرنے والے افراد و تحریکوں کے راستے کی ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔ اس وقتی فیصلہ کی روشنی میں لادینی جمہوریت کو قابل قبول بنانے کی خاطر اسلامی سوشلزم کے وزن پر ’اسلامی جمہوریت‘ کی اصطلاح متعارف کرائی گئی۔ صاحبو! سوشلزم بھی لادینیت اور جمہوریت بھی لادینیت اور الحاد۔ سوشلزم کو تو اسلامیانا غلط قرار پایا تاہم جمہوریت کو اسلامیانا درست۔ اس تضادِ فکری اور کنفیوژن نے اسلامی تحریک کی جدوجہد کو اب تک صفر کر رکھا ہے۔ یقینا قارئین راقم کو معاف کر دیں گے یہ کہنے پر کہ ’ماچھی گوٹھ فیصلہ‘ سیّد مودودیؒ کے ذہن میں جاگزیں کسی اجتہادی فکری کنفیوژن کا نتیجہ تھا۔ ایک طرف تو یہ فیصلہ اور دوسری طرف سیّد مرحومؒ کی یہ نہایت قرینِ حقیقت رائے کہ جس کا اظہار انہوں نے بجا طور پر تفہیم القرآن کی جلد دوم میں سورۂ یونس: ۱۰ کی آیات نمبر ۸۵ اور ۸۶ کے تفسیری حاشیہ نمبر ۸۳ میں کیا ہے کہ باطل قوتوں کے غلبہ و تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیامِ حق کے لیے اُٹھتے ہیں تو انہیں تین گروہوں سے پالا پڑتا ہے۔ پہلا گروہ باطل کے اصل علمبردار ہوتے ہیں جو اپنی پوری قوت سے داعیانِ حق کو کچلنے کی کوشش کرتے ہیں (مصر اور بنگلہ دیش کی رواں صورتِ حالات)۔ دوسرا گروہ نام نہاد حق پرستوں کا ہوتا ہے جو حق کو ماننے کے باوجود باطل قوتوں کے ظلم و جبر سے سخت خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اقامتِ حق کی سعی کو غیر واجب اور حماقت سمجھتا ہے اور اپنے ضمیر کی خلش مٹانے کے لیے اپنے مؤقف کو کسی نہ کسی طرح درست ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے۔ تیسرا گروہ اس جاری چپقلش کا الگ کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے والے عام الناس (عوام کالانعام) کا ہوتا ہے اور ان کا ’ووٹ‘ آخرِ کار اسی طاقت کے حق میں ’پڑا کرتا ہے‘ جس کا پلّہ بھاری رہے۔ خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ سیّد مودودیؒ کو اس عمرانی اور بدیہی حقیقت کا واضح ادراک حاصل تھا کہ حق و باطل کے معرکے میں عوام کا ووٹ غالب طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے۔ جب کہ یہ بھی ایک معلوم بات تھی کہ جمہوریّت کا الم نشرح مطلب ’عوام کے ذریعے، عوام کی حکومت، عوام کے لیے‘ ہے تو کس برتے پر یہ توقع باندھ لی گئی کہ باطل کے نہایت طاقتور مراکز کے ہوتے ہوئے ’بے دست و پا‘ عوام وقت آنے پر ’بے دست و پا‘ دینی جماعتوں کو ووٹ دیں گے اور اگر یہ ووٹ مل بھی گئے تو ووٹوں کی اس نام نہاد طاقت سے جمے جمائے طاقتور باطل نظام کو اکھاڑ پھینکا جا سکے گا۔ وقت کے گھومتے پہیے نے بالآخر یہ منظر بھی (مصر میں) دکھا دیا ہے کہ صرف ووٹ کی طاقت کافی نہیں۔ ’اپنے گھوڑے بھی تیار کرو اور

انہیں تیار بھی رکھو'۔

'تجدید واحیائے دین' سیّد مرحومؒ کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔ راہنمائی کا حق ادا کرنے کے لیے جس اساسی نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ زبردست کتاب لکھی گئی تھی اور تمام ضروری آداب کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کتاب میں ماضی میں بروئے کار لائی گئی احیائے دین کی قابلِ قدر مساعی کا بے باکی کے ساتھ خوبصورت محاکمہ کیا گیا۔ یقیناً یہ سیّد مودودیؒ کی بے مثال عالمانہ شان کو ہی سزاوار تھا۔ اُسی شاندار فکری اساس کے تتبع میں راقم نے اپنی ہیچمدانی اور کم مائیگی کے بے پایاں احساس کے علی الرّغم یہ جسارت کی ہے کہ 'یہودی نژاد جمہوریت' کے حق میں ان کا فیصلہ ایک 'فکری مغالطہ' کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ماچی گوٹھ میں منعقدہ مجالس کے حوالے سے جب بھی گفتگو کی جائے تو بالعموم فوراً یہ کہا جاتا ہے کہ سیّد مودودیؒ کے موقف سے اختلاف کرنے والوں نے 'کیا کر دکھایا ہے'۔ یہ لوگ کچھ بھی تو نہ کر سکے۔ انتخابات ۲۰۱۳ء کی روشنی میں یہ تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ جمہوریّت کا یہودی پھندا اپنے اور پھر بعض دوسری دینی جماعتوں کے گلے میں ڈالنے کے بعد ان سب نے 'کیا کارنامہ انجام دیا'؟ کیا ایسا نہیں کہ ہر ایسے انتخاب کے بعد یہ دل آزار تبصرہ ہر خاص و عام کی زبان سے سننے کو ملتا ہے کہ بھائی! انہیں تو کوئی ووٹ بھی نہیں دیتا۔ یہ کس منہ سے حکومتی اقدامات پر تنقید کرتے ہیں؟ ہر الیکشن کے بعد منہ لٹکانے کے باوجود ڈھٹائی کی حد ہے کہ ہر بار پوچھا جاتا ہے کہ متبادل کیا ہے؟ اس سے پہلے بھی عرض کیا کہ یہودیوں اور اُن کے نصرانی گماشتوں کی دنیا بھر میں بے رحمانہ دہشت گردی اور قتل و غارت گری کے بعد جمہوریّت دنیا پر ٹھونس دی گئی ہے۔ دیکھیے! اگر زیادہ سے زیادہ فراخدلی سے کام لیا جائے تو بھی صرف ڈیڑھ دوسو سال پہلے اس یہودی پھندے نے دنیا بھر کے انسانوں کا گلا دبانا شروع کیا۔ ارے دوستو! آپ متبادل کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو خود ایک دوصدی پہلے ایک خوشنما استحصالی طرزِ حکومت کی شکل میں کئی صدیوں سے رائج اور جاری وساری طرز ہائے حکومت کے مقابلے میں متبادل کے طور پر ٹھونسا گیا تھا اور تاحال ٹھونسا جا رہا ہے۔ لہٰذا انسانی تاریخ کے تجربات کی روشنی میں پہلے سے رائج ماضی کے کسی طرزِ حکومت کو عالمِ انسانیت کی بالعموم اور مسلمان ممالک کی بالخصوص ضرورت کو پیش نظر رکھ کر منتخب کر کے دوبارہ رائج کیا جا سکتا ہے۔ تعصب کے بغیر اور غیر جانبداری کے ساتھ دیکھا جائے تو عالمِ انسانیت کو کم و بیش تیرہ سو سال تک خلافت کا خوشگوار تجربہ ہوا۔ اگرچہ خلافتِ راشدہ کے بعد خلافت میں ملوکیت کی ملاوٹ ہو گئی تاہم اس ملاوٹ کا اثر اقتدار کے ایوانوں تک محدود رہا۔ اس منفی اثر کے باوجود انسانی تاریخ بڑے بھرپور انداز میں گواہی دے رہی ہے کہ ترکی میں بچی کھچی خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے تک مسلمان معاشرے اپنے زبردست 'سماجی ثبات' پر قائم رہے۔ ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد کے ذہن میں ایک امت ہونے اور وطنیت وقومیت سے بالا ہو کر ہر بھائی کا درد محسوس کرنے اور اس کا درماں کرنے کا جذبہ وداعیہ

موجود رہا۔ الحمدللہ! یہ جذبہ آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح عالمِ انسانیت کے لیے مسلمانوں کی خدمت کسی یاددہانی کی محتاج نہیں ہے۔ ملوکیت کی آلائش کے باوجود مسلمان جہاں کہیں گئے، انہوں نے انسانی عزت واحترام کا پرچم بلند رکھا۔ ظلم وجبر اور استحصال سے مظلوم آبادیوں کی گردنیں چھڑائیں اور انہیں تحفظ، آزادیٔ عمل اور احترام دیا۔ خلافت کے خاتمے کے بعد اس کے جبری متبادل کے طور پر مسلمانوں سمیت تمام انسانوں پر جمہوریّت ٹھونس دی گئی۔ اب جب کہ عالمِ انسانیت جمہوری جبر واستحصال سے تنگ آ چکا ہے تو خلافت ایک بار پھر ابرِ رحمت بن کر سایہ فگن ہونے والی ہے۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ دورِ زوال کے احساسِ کمتری اور مدافعانہ طرز پر مبنی اشاعت وتبلیغ کو خیر باد کہہ کر بھرپور اعتمادی قوت اور جدید نظریاتی وفکری تیاری کے ساتھ اسلامی نظریات وافکار کے فروغ اور غلبہ کے لیے کام کرنے والی عظیم تحریک کے کارپردازان، خاص وعام اور ارکان وکارکنان تک سبھی کے سبھی اسلام کے سیاسی نظام کی واضح تفہیم اور یقینی شعور سے اب تک محروم ہیں۔ معاف کیجیے! اگر یہ سمجھ اور شعور حاصل ہوتا اور شرحِ صدر رکھتے ہوتے تو جمہوریّت کا یہودی قلاوا اور منحوس طوق اپنے گلے سے کب کا اتار کے پھینک چکے ہوتے۔ راقم اس معاملے میں دکھ کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جدید دور کے ان گنت جمہوری تجربوں کے بعد بھی یہ لوگ اس لادینی اعتقادی کفر سے برأت کا اظہار کرنے سے کیوں ہچکچا رہے ہیں؟ آج سے ستّر اسی برس پہلے اگر کسی نے اس خوشنما جمہوری طوق کی چکاچوند سے متاثر ہو کر اس لادینیت کو وقتی یا عارضی طریقۂ کار کے طور پر اختیار کیا تو کوئی برا بھلا جواز موجود تھا کہ چلو تجربہ کر کے دیکھا جائے۔ تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے؟ حالانکہ تجربہ کرنے میں ہی تو حرج تھا اور اب یہ حرج اس قدر واقع ہو چکا ہے کہ اب ذہنوں سے جمہوریّت کا نکالنا ہی مشکل ہو رہا ہے۔ صاحبو! اسلام کے سیاسی نظام کو سمجھنے کی ایک بار پھر کوشش کرو مگر ذہن سے تمام جمہوری کیڑوں کو نکال باہر پھینکنے کے بعد۔ 'متبادل کے متلاشیوں' کی خدمت میں نیازمندانہ عرض ہے کہ اگر آپ کو اسلام کے سیاسی نظام کا فہم وشعور حاصل ہو جائے تو ابتدائی اور پہلے قدم کے طور پر جمہوری غلاظت سے چھٹکارا حاصل کریں۔ پہلے فکری دامن پر لگی غلاظت دھوڈالنا نہایت ضروری ہے۔ اللہ کریم کا کرم ہے کہ متبادل تو پہلے سے موجود ہے۔

بیسویں صدی کے آخری عشرے تک پہنچتے پہنچتے ملتِ اسلامیہ دو بڑے عملی اور فکری تجربات کر چکی تھی۔ تب سے راقم کا یہ خیال ہے کہ اکیسویں صدی کا جغرافیہ اور تاریخ ان دو بڑے تجربات کے نتائج کی روشنی میں تشکیل پائیں گے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں افغانستان میں جہاد کا تجربہ اور اسی صدی میں بطورِ خاص ترکی میں جمہوریت کا تجربہ، بعدہ ایک بڑے واقعہ کے طور پر الجزائر کے ۱۹۹۱ء کے 'جمہوری' انتخابات اور پھر مابعد اس ملک کے عوام کی رائے پر ڈاکہ اور اب تک کے حالات وواقعات کا گردوغبار۔ یاد رہے کہ اس ملک میں اسلامی سالویشن فرنٹ نے ۹۰ فی صد سے بھی زیادہ ووٹ حاصل کیے تھے۔

جمہوریّت کے متبادل کے متلاشی دوست، الجزائر کے ان انتخابات کو ۲۲ برس بیت چلے، ذرا آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کریں۔ جمہوریّت جمہوریّت کی رٹ لگانے والے یہودی ونصرانی گماشتوں نے وہاں اب تک جمہوریّت کا متبادل نظام (جرنیلی آمریّت کا نظام) قائم کررکھا ہے۔ بیسویں صدی کی ۱۹۸۰ءاور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں کے ان تجربوں نے واضح پیغام دیا تھا کہ: ۱) جہاد کا اثبات کریں اور ۲۔ جمہوریّت کا انکار کریں۔

....

قارئین کرام! اس تفصیلی جائزے کے بعد آپ نے باور کرلیا ہوگا کہ جمہوری (پارلیمانی اور صدارتی)، جرنیلی (مارشل لاء) یا آمرانہ حکمرانی (حسنی مبارک برانڈ اور بادشاہی، جیسے اردن میں شاہ عبداللہ برانڈ) دراصل عالمی 'طاقت کے مرکز' (یہودی سرمایہ داروں اور مہاجنوں کے گٹھ جوڑ) کے مختلف پرتو ہیں۔ اور اپنی اصل میں تمام بنی نوعِ انسان کا استحصال کرنے کے علاوہ ان کی کوئی اور شناخت نہیں۔ یوں پورا عالمِ انسانیت پنجۂ یہود کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے اور اس وقت زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ مختصراً عرض ہے کہ:

اول: پوری دنیا کو اپنی حرص و آز کا مسلسل اور مستقلاً نشانہ بنانے کے لیے ان ننگِ انسانیت مہاجنوں نے ذیلی وعلاقائی اور گماشتی طاقت کے مراکز کا خوفناک جال بچھا رکھا ہے۔ جنھیں بہرحال وہ وقت آنے پر ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینکتے رہتے ہیں۔ راقم یہاں ان کی مثال پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اس سے وابستہ ہر ملک، علاقے اور خطّے میں عبرت کی داستانیں نہ صرف مقامی تاریخ کا جزوِلاینفک ہیں بلکہ مزید بھی جنم لیتی رہتی ہیں اور ہر کس وناکس کے علم میں ہیں۔

دوم: اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے جدید ٹیکنالوجی سے مسلح بغل بچہ قسم کے ذرائع ابلاغ اور خفیہ اداروں اور ایجنسیوں کو 'مطلوبہ ماحول' بنانے کے لیے بہت جھوٹ اور تھوڑے سچ کے ملغوبہ کے ساتھ دن رات بلاتکان استعمال کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے قلم اور ضمیر کی خریداری پر بے دریغ سرمایہ کاری بھی کی جاتی ہے۔

سوم: اسی طرح ان ذرائع ابلاغ کے ذریعے حسبِ تقاضائے حالات وقتی لہریں پیدا کر کے انتخابات سے پہلے کے زمانے اور بعد کے حالات میں ستم ظریفانہ استحصال کے لیے سازگار ماحول تیار رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا بار بار کے تجربات کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ ووٹ کے ذریعے کسی سوچی سمجھی اور مستقل نوعیت کی رائے کا اظہار نہیں کیا جاتا یا نہیں کرایا جاتا بلکہ یہ پالتو ذرائع ابلاغ اور خفیہ اداروں کے ذریعے پیدا کی گئی 'وقتی لہر' کے نتیجے میں عوام کے ذہنوں میں ڈالی جانی والی عارضی، کسی حد تک جذباتی اور غیر مستقل یا وقتی رائے ہوتی ہے۔ جسے فوری بعد انتخابات کا ڈھونگ رچا کر منصوبہ عمل کے مطابق حسبِ منشاء حاصل کرلیا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی موسم کی کوئی فصل کاٹی جاتی ہے۔ موسم

(وقتی لہر) بدل جائے گا توفصل (رائے) بھی اس کے مطابق بدل جائے گی۔ براہِ کرم! تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے اس نکتہ پر غور فرمائیں۔ آپ کو واضح طور پر ہر موسم (ہر انتخاب کے موقع پر اُٹھائی گئی وقتی لہر) کی فصل (ووٹروں کی رائے) مختلف دکھائی دے گی۔ لہٰذا حسبِ موقع وضع کردہ حربوں کے ذریعے وقتی لہریں پیدا کر کے اپنے ڈھب کے جمہوری گھوڑے اور خچر اپنے استحصال کا نشانہ بنائے گئے تانگے (ممالک واقوام) کے آگے جوت دیئے جاتے ہیں۔ مطلب نکل جانے کے بعد نہ یہ گھوڑے ہوتے ہیں، نہ خچر، نہ کٹھ پتلی حکمران، اب یہ سب 'ٹشو پیپر' ہوتے ہیں اور بڑی نفرت کے ساتھ پھینک دیے جاتے ہیں۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**۔ وقتی لہر پیدا کرنے کی ایک نمایاں مثال انتخابات سے بہت پہلے معصوم بچی 'ملالہ' پر حملے کے بعد اس بے بسی لڑکی کا ابلاغی استحصال ہے۔ پالتو ذرائع ابلاغ کے ذریعے کذب وافتراء کا طوفان برپا کر کے اس بیچاری لڑکی کے قد کاٹھ میں مصنوعی اضافہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ یہ کوشش تاحال جاری ہے (اقوام متحدہ میں ملالہ کی حالیہ تقریر)۔ ڈھٹائی کی حد ہے۔ ویسے برسبیلِ تذکرہ عرض ہے کہ تہذیبی اور عسکری شکست سے دوچار اہلِ مغرب اگر یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تعلیم وتہذیب کے لیے کسی 'ملال' یا کسی 'ملالہ' کی آڑ میں مسلم معاشروں میں وہ کوئی پیشرفت کر لیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اسلامی تعلیم وتہذیب تو اس وقت تمہارے اپنے معاشروں میں 'انتہا پسندی برانڈ' منفی پروپیگنڈا کے باوجود بڑی تیزی سے قبولِ عام حاصل کر رہی ہے ؎

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے!

چہارم: جعلی جمہوری مینڈیٹ کے حصول کے لیے آنکھوں میں دھول جھونکنے کے علاوہ انتخابی عملہ پر دباؤ (مثال کے طور پر صوبہ سندھ میں ایک ضمنی الیکشن میں ایک خاتون امیدوار کا ایک خاتون پولنگ آفیسر پر تشدد، کراچی اور حیدرآباد میں ٹی ٹی پستول (یعنی جبر کا فیکٹر)، جبری ووٹر، آنکھوں کی بھوک کا شکار ٹاؤٹوں کے ذریعے اِسی بھوک کا شکار ووٹروں کی خرید وفروخت ایسے بظاہر نظر نہ آنے والے ہتھکنڈوں کا بے دریغ استعمال، ان جمہوری ٹھیکیداروں کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے۔

تاہم اللہ مجدہ کریم کی سنت کے عین مطابق اس کی جلالت مآب مشیّت نے دجل وفریب پر مبنی ان کی بظاہر خوشنما، بباطن دہشت ناک خفیہ کارروائیوں کے سارے بھید کھول کے رکھ دیئے ہیں۔ نقاب الٹنے کے اس فطری عمل نے انہیں بدحواس کر دیا ہے۔ نتیجتاً قوت کے عالمی مرکز کو اوچھی حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ معصوم محترمہ ڈاکٹر عافیہ کی ڈرامائی گرفتاری اور ناروا قید وبندان کی بدحواسی پر دلالت کرتی ہے۔

اس طرح وجود میں لائی گئی مصنوعی صورتِ حالات میں دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کو بالعموم اور جگہ

جگہ نسل کشی کا شکار (کشمیر، چیچنیا، سنکیا نگ، اراکان، فلسطین، الجزائر، مالی، صومالیہ، نائیجیریا، عراق، افغانستان، برطانیہ، امریکہ اور پتا نہیں کہاں کہاں؟؟) مسلمانوں کو بالخصوص یہود و نصاریٰ کے بے رحم اور خونیں پنجوں سے چھڑانے کے لیے پوری قوت کے ساتھ اسلام کا امن و سلامتی کا پیغام پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہر ملک اور ہر خطے میں بطورِ خاص اسلامی انقلابی قیادت کو سیرت اور کردار کا نہایت اعلیٰ نمونہ بن کر رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہوگا۔ دراصل اس وقت ملتِ اسلامیہ کے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف اسلامی قیادت کی اعلیٰ بصیرت، پختہ عزم اور شاندار حکمتِ عملی میں پوشیدہ ہے۔ قائد دنیا میں ہمیشہ اکیلا آتا ہے اور پھر اپنی حکومت و دانائی کے بل پر تزکیہ و تربیت کے ذریعے قبیلوں کو اور قوموں کو انقلاب کے لیے تیار کرتا ہے اور تبدیلی (انقلاب) کا استعارہ بن جاتا ہے۔ کسی مغربی حکمران اور دانشور کا قول ہے کہ گیدڑوں کا لشکر ہو اور ان کا لیڈر شیر ہو تو یہ سارے شیر ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی لشکر میں سارے شیر ہوں مگر ان کا لیڈر گیدڑ ہو تو وہ سب گیدڑ بن جاتے ہیں۔ یہ محض قول نہیں۔ اس پر انسانی تاریخ کی جدلیاتی گواہی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔ لہٰذا دینی اسلامی تحریکوں کے قائدین کو اس نکتہ پر زیادہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سوچنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کرنیں شمع سے پھوٹتی ہیں، کرنیں جمع ہو کر شمع کو وجود میں نہیں لاتیں۔ سچ یہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کا ہر کارکن پہاڑی کا چراغ ہے۔ ذرا موجودہ حوصلہ شکن ماحول کو دیکھیں اور ان کارکنوں کی 'امیر کی اطاعت' کرنے کے معاملے میں استقامت کو دیکھیں تو انقلابِ اسلامی دو ہاتھ پہ دکھائی دیتا ہے۔ امت کو درپیش اصل مسئلہ صاحبِ کردار، صالح اور زیرک قیادت کا فقدان ہے۔

مودبانہ گزارش ہے کہ زبردست ہمت اور قائدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کر کے جمہوری صنم خانے کے سارے بتوں کو پاش پاش کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اپنے مضبوط صالحانہ کردار کو بروئے کار لا کر تزکیہ و تربیت کی پُرعزم مہمات کا آغاز کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ وطنِ عزیز میں ظلم و استحصال کی چکّی میں چھیاسٹھ برسوں سے پستے، خودکشیاں کرتے انسانوں اور مسلمانوں کو ووٹ کے لالچ اور آلائش سے پاک انداز میں دعوت و تذکیر کے ذریعے اسلام کا ٹھنڈا اور پرسکون (روحانی سکون سے مالامال) پیغام دینے کے عمل سے بے شمار برکات نازل ہوں گی اور نصرتِ الٰہی کا ورود ہوگا۔ ان شاءاللہ!

آسمان ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش!
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
(اقبالؒ)